پروفیسر کلبِ عابد
(صدر شعبۂ دینیاتِ شیعہ)

عمادالتحقیق

تحقیقی کتاب اور مقالہ کس طرح تحریر کرنا چاہیے

از طرف فیکلٹی آف تھیالوجی شعبۂ دینیات شیعہ
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

پروفیسر کلب عابد
صدر شعبۂ دینیات شیعہ

عماد التحقیق

تحقیقی کتاب، اور مقالہ کس طرح تحریر کرنا چاہیئے

از طرف

فیکلٹی آف تھیالوجی شعبۂ دینیات شیعہ
مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

ناشر ... فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پرنٹر ... نظامی پریس لکھنؤ

تعداد ... ۵۰۰

جولائی ... ۱۹۷۸ء

قیمت ۶ روپے

فہرست مضامین

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وآلہ الطاہرین۔

کھوج، اور نئی نئی باتوں کی تلاش کا جذبہ، اللہ کی طرف سے انسانی فطرت کے لیے ایک عظیم عطیہ ہے۔ ایک بچہ جب ذرا بڑا ہوتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیت کچھ بیدار ہوتی ہے، تو اسے کیا اور کیوں کی فکر شروع ہو جاتی ہے۔ اسکے سامنے جو چیز بھی آتی ہے، اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی بزرگ بچے کے سوالات سے پریشان ہو جاتے ہیں، اُن کے ڈانٹنے سے وہ چپ تو ہو جاتا ہے، لیکن تفتیش کی پیاس بجھتی نہیں، کچھ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر اس جذبہ کے لیے زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، جس سے بچہ اس کو دبانے پر مجبور ہے، تو ذہنی الجھاؤ اور جذباتی تناؤ، مختلف رُوحانی بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی تحقیق کا جذبہ جب عملی تجربہ کی شکل اختیار کرتا ہے، تو بچہ چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح درحقیقت وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ شئی کیسے بنی ہے، اور اس کو دوبارہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اسی بچہ کی طرح نوع انسانی اپنے زمانہ طفولیت ہی سے تلاش و جستجو میں لگی ہوئی ہے، یہ نئی باتوں کی دریافت سے فطری لگاؤ ہی ہے، جس کے طفیل میں، درختوں اور پہاڑوں کی کھو میں زندگی گزارنے والا انسان آج چاند پر پہنچ چکا ہے، اور دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈالنے کی فکر میں ہے، جبکہ دوسری مخلوق وہیں ٹھہری ہوئی ہے، جہاں ہزاروں سال پہلے تھی۔

تسلیم ہے کہ شہد کی مکھی، بیا اور اسی طرح بہت سے جانور بڑے حسین، مضبوط اور انجینیرنگ کے

اصول سے درست مکان اس وقت بناتے تھے، جب انسان اینٹ پر اینٹ رکھنے سے واقف نہ تھا، لیکن یہ تمام مخلوقات اب بھی وہیں ہیں جہاں تھے۔ اور انسان جذبہ تحقیق ہی کے سہارے ترقی کی راہ میں چھلانگیں لگاتا، کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ یہی ذوقِ جستجو ہے جو اسکو زمین کا سینہ شگافتہ کرنے، سمندروں کو کھنگالنے، جنگلوں کی خاک چھان نے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے پر ابھارتا ہے، اس راہ میں اس نے کتنی جانی اور مالی قربانیاں پیش کی ہیں، کوئی حساب داں حساب لگا کر نہیں بتا سکتا۔

کاروانِ تحقیق کی کوئی منزل نہیں، ہر جدید تحقیق نئی راہیں کھولتی جاتی ہے، اور ہر منزل دوسری منزل کے لیے نشانِ راہ بنتی جاتی ہے۔ ہر معلوم کسی مجہول کی طرف اشارہ کرکے سمندِ شوق کے لیے مہمیز بن جاتا ہے اور ہر پردہ اٹھ کر، کسی دوسرے پردے کو اٹھانے کے لیے دستِ سعی کو آمادہ کرتا ہے۔

نہ کائنات کے رازہائے سربستہ کبھی ختم ہوں گے، اور نہ کاروانِ تحقیق کسی منزل پر ڈیرے ڈالے گا، یہ وہ مسافر ہے جس کا سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں، بلکہ سفر ہی اسکی اصلی منزل ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کسی بھی فن کے اصول و قواعد، ابتدا میں غیر مرتب ہوتے ہیں، انسان صرف اپنے ذوق کے سہارے قدم بڑھاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ دوسروں، اور اپنے تجربات کے سہارے، ان کو مرتب کرتا جاتا ہے، اور وہ مدتوں میں وہ تکمیل کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ نہ شاعری کے اوزان پہلے سے موجود تھے، نہ موسیقی کے اصول ہمیشہ سے موجود تھے، نہ نحو و صرف کے قواعد ابتدا سے پائے جاتے تھے، سب رفتہ رفتہ ایک مدت میں تکمیل کی منزل تک پہنچتے ہیں یوں ہی تحقیق کے اصول و قواعد بھی ابتدا میں مرتب نہ تھے۔ لوگ اپنی سوجھ بوجھ کے سہارے آگے قدم بڑھاتے جاتے تھے، جب طریقے میں زحمت محسوس ہوتی، اس کو ترک کرکے نیا انداز اختیار کرتے تھے، ایک کے تجربہ سے دوسرے نے فائدہ اٹھایا۔ جہاں ایک نے ٹھوکر کھائی، وہاں دوسرا سنبھل گیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ تحقیق کے اصول و قواعد مدون و مرتب ہوتے چلے گئے۔

یورپ اور ایشیا کے وہ ممالک جنھوں نے میدانِ تحقیق میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے ہیں، اُن کے دامن ریسرچ کے اصول و قواعد کی کتابوں سے مالا مال ہیں لیکن ہماری زبان اُردو، اس معاملہ میں تہی دامن ہے۔ بلکہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فارسی اور عربی میں بھی اس موضوع پر زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ میں نے خود بھی تلاش کیا اور باخبر حضرات سے دریافت بھی کیا لیکن فارسی میں تو اس قسم کی کتاب کا پتہ نہیں چلا۔ (اب سُنا ہو کہ اس موضوع پر ایک اچھی کتاب بازار میں آئی ہے) عربی میں بھی صرف ایک ہی کتاب کا علم ہو سکا، جو شعبۂ دینیات شیعہ کے ام۔ ٹی۔ اچ کے نصاب میں داخل ہے۔ میری مُراد ہے ڈاکٹر "احمد شیبی" مصری کی کتاب "کیف تکتب بحثاً او رسالۃ" مکتبۃ نہضۃ مصریہ،

ڈاکٹر احمد شیبی نے اپنی کتاب میں موضوع سے پورا انصاف کیا، بڑی محنت سے کتاب مُرتب کی ہے، جن محققین نے اس موضوع پر لکھا ہے، ان کی تحقیق سے بھی بدرجہ اتم فائدہ حاصل کیا ہو (جیسا فہرست مصادر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔)

علی گڑھ یونی ورسٹی میں آنے کے بعد میری نظر سے بعض تھیسس گزریں، جس سے اندازہ ہوا ہمارے طالب علم پوری طرح ریسرچ کے قواعد سے واقفیت نہیں رکھتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ریسرچ کے انداز اور اسکے قواعد پر اُردو میں کوئی کتاب ہونا ضروری ہے۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے یہ کتاب عماد التحقیق مُرتب کی ہے، اس کا زیادہ تر مواد "احمد شیبی" کی مذکورہ بالا کتاب سے لیا ہے لیکن ہندستان کے حالات، اور اپنے شعبے تھیالوجی کے پیشِ نظر اس میں اتنی کمی، زیادتی اور تبدیلی کی گئی ہے کہ یہ نہ تو مذکورہ کتاب کا ترجمہ ہے، اور نہ کوئی مستقل علاحدہ تصنیف ہے، بلکہ یہ ان دونوں کے "بین بین" کتاب ہے۔ "اعراب، علامتیں، رموز و اوقاف" کی سرخی کے تحت ملحقات کا پورا حصہ جناب رشید حسن خاں صاحب کی کتاب۔ اردو املا[1] کی تلخیص ہے۔

---

[1] مذکورہ کتاب اردو املے کے موضوع پر بڑی جامع اور مانع کتاب ہے مصنف نے پوری داد تحقیق دی ہے، یہ کتاب ترقی اردو بورڈ نے طبع کروائی ہے۔ نیشنل اکادمی۔ ۲۹ انصاری گیٹ، دریا گنج۔ دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے طلب کی جا سکتی ہے

اگر خداوند عالم کی مہربانی سے، راہ تحقیق میں گامزن طلبہ کو میری اس کتاب سے کچھ فائدہ ہوا، تو اپنی سعی کو رائیگاں نہ سمجھوں گا۔ اگر صاحبانِ نظر مجھے میری کوتاہیوں پر متوجہ کریں گے، تو میں اُن کا شکر گذار ہوں گا، اور دوسرے اڈیشن کی نوبت پر ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

وما توفیقی الا باللہ العظیم واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سید کلب عابد، ۴م، بی، نذیر احمد روڈ، ام۔ یو۔ علی گڈھ

پہلا باب

تھیس۔ (تحقیقی کتاب یا مقالہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحقیق:- عربی لفظ ہے یہ باب تفعیل سے مصدر ہے، اس کے اصلی حروف ح۔ ق۔ ق ہیں اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا تقریباً انھیں معنوں کی یں انگریزی لفظ RESEARCH بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں Careful investigation پوری ہوشیاری سے کھوج اور تلاش۔ لفظ کے معنوں ہی سے ظاہر ہے کہ تحقیق در یسرچ کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔

۱۔ کوئی سچ اور واقعہ ہو جس تک پہنچنا مقصود ہو۔

۲۔ کچھ پردے اور اشتباہات ہوں جن کو دور کرنا ہو تاکہ حقیقت نمایاں ہو سکے۔

مذکورہ لفظی معنوں سے ہی اسکی اصطلاحی تعریف بھی سمجھی جا سکتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

تحقیق کی اصطلاحی تعریف:- کسی اُلجھے ہوئے یا غیر معلوم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے، تمام ضروری ماخذ و مصادر کی پوری چھان بین کر کے غیر جانبداری سے صحیح نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

تھیسس (تحقیقی رسالہ): زیر بحث مسئلہ کے متعلق ریسرچ اسکالر کی سعی و کوشش کے وہ مدونہ نتائج جن کو تمام ضروری مالہ وما علیہ اسناد اور دلیلوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

تھیسس کے ارکان

مخلصانہ کوشش:- تھیسس کی کامیابی میں بڑا دخل اس بات کا ہے کہ محقق کے پیش نظر صرف حقیقت تک پہنچنا ہو۔ تحقیق کے نتیجہ میں جو بات ثابت ہو اُس کو مخلصانہ طور پر بلا کم وکاست پیش کر دے، چاہے ثابت شدہ حقیقت اس کے جذبات کے بالکل خلاف ہو، اور اسکے احساسات کو ٹھیس ہی کیوں نہ پہنچی ہو۔ ریسرچ اسکالر کو اپنی تحقیق کی ابتدا شک سے کرنا چاہیئے، یعنی پہلے سے نفی و اثبات کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرلے۔

تھیسس اور مناظرہ کی کتاب میں یہی بنیادی فرق ہے، کہ مناظر پہلے سے ایک بات طے کیے ہوتا ہے، اور اپنی معینہ رائے کے ثبوت میں دلیلیں اور شواہد تلاش کرتا ہے، جو باتیں اسکی رائے کے خلاف پڑتی ہوں چاہے وہ واقعاً کتنی ہی مضبوط ہوں ان کو رد کرتا جاتا ہے، اور جو چیزیں اس کے مقصد میں معین ہوں وہ کمزور ہی کیوں نہ ہوں اُن کو تقویت دیتا جاتا ہے۔ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے الفاظ کے گورکھ دھندوں اور مغالطوں سے کام لیتا ہے، لیکن ایک محقق یہ سب نہیں کرتا۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر کے پیش کرتا ہے۔ دونوں کا فرق مختصر لفظوں میں یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ ریسرچ اسکالر دلیل کا تابع ہوتا ہے اُدھر جاتا ہے جدھر دلیل لے جاتی ہے۔ اور مناظر دلیلوں کو اپنی راہ پر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ریسرچ اسکالر کسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسکی سعی کا مقصد حقیقتوں کا منکشف ہونا ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد ایک رائے قائم ہو جاتی ہے؛ اور اس کے مطابق ایک عمارت کا نقشہ بنا لیتا ہے لیکن جب تحقیق آگے بڑھتی ہے تو کچھ ایسی نئی باتیں سامنے آجاتی جو اب تک کے تحقیق کے منافی ہوتی ہیں، اور پوری بنی بنائی عمارت کو ڈھادیتی ہیں، ریسرچ اسکالر کے لیے یہ منزل بہت سخت ہوتی ہے، اپنی بنائی عمارت کو اپنے ہاتھوں ڈھانے پر دل راضی نہیں ہوتا اب تک کے کیے کرائے پر خود پانی پھیرنے سے جذبات کو دھچکا لگتا ہے۔ لیکن دیانتداری کا تقاضہ ہے کہ نئی حقیقتوں کو تسلیم کیا جائے، یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اب تک کی محنت رائیگاں ہوگئی، تحقیق و تلاش کے سلسلے میں کیا ہوا کام بے کار نہیں جاتا۔ معلومات میں جو اضافہ ہوا، ذہن کو جو روشنی مل چکی وہ ہر منزل پر کام آتی رہے گی۔ علماء و محققین اپنی رائے سے عدول کرنے اور سابقہ نظریات کو رد کرنے سے نہیں ہچکچاتے ہیں۔ اس سے ان کی حق پسندی اور عصبیت سے دوری کا پتہ چلتا ہے اسکی ایک تازہ مثال جناب عامر عثمانی ایڈیٹر "تجلی" کی ہے موصوف ایک سال محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کی تائید کرتے رہے، مگر جب زیادہ گہری نظر کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو اس کے اعلان کر دینے اور اصلاح کی سعی پر ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔

موصوف نے بقول خود دہینوں تک جناب محمود احمد عباسی کی کتاب خلافت معاویہ، و یزید کی حمایت میں صفحات سیاہ کیے "خلافت معاویہ و یزید مکتبہ تجلی سے چھاپی گئی پھر یک لخت ایک مدت تک خاموشی کے بعد "ہم رجوع کرتے ہیں۔" کی سرخی سے تجلی کے اکتوبر و نومبر ۱۹۷۱ء کے پرچے میں اس حمایت باطل پر اپنی شرمندگی اور توبہ کا اعلان کیا۔ مضمون طولانی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" دیکھ کر اس کی رد کے خیال سے امہات کتب و اصل ماخذ کا مطالعہ شروع کیا ___ تو بقول ان کے "لیکن یہ اعتراف کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں کہ جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا یہ حقیقت ہمارے سامنے ابھرتے سورج کی طرح آتی چلی گئی کہ متعلقہ موضوع پر ہمارے بعض مزعومات کم علمی پر مبنی تھے۔ جن کی وکالت ہم اس خوش فہمی کر رہے تھے کہ حق یہی ہے۔ ہم پر کھلتا گیا کہ "خلافت معاویہ و یزید" ایک فریب ہے جو تاریخ اسلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اپنی کاوشوں پر پانی پھیرنے سے دل پر کیا گذرتی ہے اس کا اظہار عامر صاحب اس طرح کرتے ہیں، "کیسی قیامت گذر گئی ہو گی ہمارے دل و دماغ پر۔ اندازہ کیجیے جس موقف کی حمایت پر ہم نے تقریباً سال بھر تک جھک ماری وہی ہمارے سامنے جہالت بے خبری کا مکروہ مجسمہ بن کر سامنے آ کھڑا ہوا۔" اپنی گذشتہ کدو کاوش کو خود رد کرتے بہت سی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔ لیکن ان کو ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ہیچ سمجھنا چاہیے۔ جناب عامر عثمانی فرماتے ہیں۔ "اسی احساس نے آخر اس پر آمادہ کر دیا دینا چاہیے کچھ ہی کہے، جاہل کہے، احمق کہے، ساقط الاعتبار کہے، غیر ذمہ دار کہے۔ ہر حال میں ہمیں یہ اعلان کر دینا ہے کہ "خلافت معاویہ و یزید" کی حمایت ہم نے از راہ جہل کی تھی"۔ ماہنامہ تجلی صد ۱۹ ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۷۱ء۔

مذکورہ بالا امثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ محقق کے لیے اپنی بات کی اپچ شایان شان نہیں ہے بلکہ جیسے ہی اپنے نظریہ کا خلاف حق ہونا واضح ہو جائے فوراً اس سے عدول کر لینا چاہیے۔

۱۔ مجتہدانہ نظر اور مذاقِ تحقیق

ریسرچ کے میدان میں آنے سے قبل طالبِ علم کو اپنی جگہ یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ وہ اس میدان کا مرد بن سکتا ہے کہ نہیں؟ کیوں کہ تحقیق کے لیے صرف محنت اور کد و کاوش کافی نہیں ہے، سعی و کوشش سے مواد جمع کیا جا سکتا ہے، ماخذ و مصادر تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے، جمع شدہ مواد کو مدون و مرتب کیا جا سکتا ہے، مگر کامیاب تھیسس کے لیے صرف یہی باتیں کافی نہیں بلکہ طالبِ علم کے ذہن کو ایسا منطقی ہونا چاہیے کہ وہ درست نتائج حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس کا ذہن بات میں بات پیدا کرنے، نئے سوالات خود ڈھونڈنے اور ان کے حل تلاش کرنے کی اہلیت رکھتا ہو کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ حاصل شدہ معلومات ہمیشہ صحیح نتائج تک پہنچائیں۔ ایک ہی طرح کا مواد مختلف افراد کے سامنے ہوتا ہے لیکن مختلف ذہن زاویۂ نگاہ بدل جانے سے الگ الگ فیصلے کرتے ہیں مثلاً مختلف لوگ کسی ملک میں پھیلی ہوئی افراتفری، بد دیانتی اور لاقانونیت پر غور کرتے ہیں، لیکن ان میں کچھ تو فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، کچھ لوگ اس کا سبب مذہب سے دوری، اخلاقی اقدار کی بے قدری اور خواہشاتِ نفس کا غلبہ قرار دیتے ہیں، دوسرے لوگ اس کا سبب معاشی اور اقتصادی عدم مساوات کہتے ہیں، حالات سب کے سامنے ایک طرح کے ہیں لیکن نتائج مختلف اخذ کیے گئے، یا اسلامی اعتبار سے یوں سمجھیے کہ آیات و احادیث اور اصولِ استنباط سے بہت سے علماء واقف ہوتے ہیں لیکن جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور مجتہدین بھی اپنے علمی پائے اور اجتہادی مہارت کے اعتبار سے الگ الگ رائے قائم کرتے ہیں۔

یوں سمجھیے کہ بازار سے لوہا، سمنٹ، اینٹیں ہر وہ شخص خرید سکتا ہے جس کی جیب میں دام ہوں، لیکن ایک مناسب عمارت بنا لینا ہر ایک کا کام نہیں، کسی ماہر انجینئر کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔ وسیع مطالعہ

ہم نے بتایا کہ ریسرچ اسکالر کے دماغ میں صحیح نتائج حاصل کرنے کی

صلاحیت ہونا چاہیئے، مگر صرف یہ صلاحیت بھی کافی نہیں ہے، کیوں کہ انسان جو فیصلے کرتا ہے وہ حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہوتے ہیں، فکر و نظر کے معنی ہی ہیں معلومات سے مجہولات کو حاصل کرنا، جیسی معلومات ہوں گی ویسے ہی نتائج حاصل ہوں گے۔ ناقص معلومات سے غلط نتیجے نکلتے ہیں لہٰذا وسیع مطالعے اور کثیر معلومات کا ذخیرہ بہت ضروری ہے، موضوع کے متعلق تمام پہلو سامنے ہونا چاہیئے۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیئے کہ دوران مطالعہ میں جو باتیں زیر نظر آئیں اُن کو ترتیب وار جمع کرتا جائے اس کے دسترس میں جہاں جہاں سے بھی مواد حاصل کرنا ممکن ہو حاصل کرے۔

(۳) دوسروں کی رائے سمجھنے یا ان کی عبارت نقل کرنے میں جلدی نہ کرے بعض اوقات کسی عبارت سے ظاہری نظر میں کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے، لیکن جب سیاق و سباق سے ملا کر دیکھا جائے تو دوسری ہی بات معلوم ہوتی ہے، کبھی کبھی کتابت کی غلطی مفہوم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔

(۴) دوسروں کی رائے ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اختیار نہ کرے بلکہ بڑے سے بڑے شخص کے نظریہ پر خود غور کرے، منطقی اعتبار سے قابل قبول باتوں کو اختیار کرے اور جو نظریے عقلی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں ان کو رد کر دے، محقق کو ہمیشہ "ما قال" پر نظر رکھنا چاہیئے، "من قال" پر توجہ نہ دینا چاہیئے۔

کچھ دوسری باتیں:۔ (۱) تھیس سے علمی دنیا کو کوئی فائدہ ہو، کچھ روشنی ملے، کوئی نئی راہ کھلے، کوئی نیا قدم آگے بڑھے، کیوں کہ ریسرچ اسکالر کا اصل کام یہی ہے کہ علمی میدان میں اس نے کچھ اضافہ کیا ہو۔ دوسرے محقق جہاں تک پہونچ چکے ہوں، اُن سے کام کو آگے بڑھایا ہو، جدت کا یہی مطلب نہیں ہے کہ ہر اسکالر کوئی نئی بات ہی پیدا کرے، اور کسی غیر معلوم نتیجے سے روشناس کرائے، یہ بھی نیا کام ہے کہ کسی غیر مرتب مواد کو منظم و مرتب کر دے، یا کسی منظم مواد کو ایسی نئی تنظیم و ترتیب دے دے جس نے

وہ زیادہ مفید اور واضح ہو جائے، یا ثابت شدہ حقائق کے لیے ایسے نئے وجوہ و اسباب تلاش کرے جس سے کچھ شکوک دُور ہوں اور وہ زیادہ روشن ہو جائیں۔

(۲) تحریر شگفتہ اور دلچسپ ہونا چاہئے جو مطالعہ کرنے والوں کی توجہ کو جلب کرے معلومات پیش کرنے کا انداز ایسا ہو کہ ابتداء ہی سے پڑھنے والے پر یہ تاثر ہو جائے کہ مفید معلومات حاصل ہو رہی ہیں اور ذہن کو روشنی مل رہی ہے۔ عبارت، الجھی ہوئی، الفاظ نامانوس نہ ہوں، اور کلام لفظی و معنوی تعقید اور ابہام سے پاک ہو، مواد مسلسل اور مرتب ہو، مضامین کی بے ربطی دلچسپی کو کم کر دیتی ہے۔

منازل تحقیق:- ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں ریسرچ کی تین منزلیں قرار دی گئی ہیں:-

ایم فل (ماسٹر آف فلاسفی) یہ ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی درمیانی کڑی ہے بعض یونیورسٹیوں کے کچھ شعبوں میں، پی۔ ایچ۔ ڈی سے قبل اسی مضمون کے کسی جز یا مرتبط مسئلے میں ایم فل کرنا لازم ہوتا ہے، اور بعض شعبوں میں یہ ڈگری اختیاری قرار دی گئی ہے۔ کچھ شعبے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ایم اے فرسٹ ڈویزن میں پاس نہیں کیا ایم فل کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اور جو فرسٹ ڈویزن میں کامیاب ہوئے ہیں ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہے کریں یا نہ کریں اس کے لیے سپروائزر کے مشورے سے ڈیپارٹمنٹ سلیبس معین کرتا ہے جس کو ایڈوانس اسٹڈیز کمیٹی منظور کرتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ممتحین کا تقرر ایڈوانس اسٹڈیز کمیٹی کی سفارش پر اکزیکیوٹو کونسل کرتی ہے اس میں موضوع کے مطابق ایک مقالہ تحریر کرنا ہوتا ہے، تحریری امتحان اور ریویو ہوتا ہے۔ ہر ایک میں کم از کم پچاس فی صدی نمبر حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم ایم فل میں ناکامیاب ہو جائے تو پھر پی ایچ ڈی میں داخلہ نہیں ملتا۔ اس کے فائدے یہ ہیں کہ طالب علم کو ایک ڈگری مل جاتی ہے اگر پی ایچ ڈی مکمل نہ کر سکے تو ایم فل خود بھی ایک مستقل ڈگری ہے (ریسرچ

کی مشق ہو جاتی ہے۔ موضوع کے متعلق ابتدائی معلومات ہو جاتی ہے۔ یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ موضوع سے متعلق آگے کام کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں سپروائزر کو بھی طالب علم کی تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس امیدوار طالب علم کا پی ایچ ڈی کی سعی لاحاصل میں وقت تو خراب نہیں ہوگا۔ ایم فل کی کم سے کم مدت ایک سال ہوتی ہے۔

پی، ایچ، ڈی:۔ اس ڈگری کے لیے ماسٹر ڈگری (ایم کام۔ ایم ایس سی۔ ایم اے وغیرہ) اور بعض شعبوں میں ایم فل میں کامیابی ضروری ہوتی ہے۔ جن طلبا نے ایم فل نہیں کیا ہے، لیکن موضوع پر کچھ تحریری کام کرچکے ہیں تو وہ، ورنہ جس، انداز پر کام کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک خاکہ فارم داخلہ کے ساتھ داخل کرنا ہوتا ہے پی ایچ ڈی کے لیے پہلے سے کوئی نصاب مقرر نہیں کیا جاتا بلکہ موضوع کے مطابق مواد کی تلاش و جستجو پوری طرح طالب علم کے صوابدید پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کی کم سے کم مدت دو سال قرار دی جاتی ہے۔

ڈی لٹ:۔ یہ پی ایچ ڈی کے بعد کی اور تعلیمی سلسلے کی انتہائی ڈگری ہے، اس کے لیے عام طور پر یہ شرط ہوتی ہے موضوع پر کم از کم پانچ برس کام کرے تب تھیسس جمع کرنے کا حق ہوتا ہے۔ ڈی لٹ اسی موضوع پر کرسکتا ہے جس میں پی ایچ ڈی کرچکا ہو، یا جو پی ایچ ڈی کے موضوع سے قریبی تعلق رکھتا ہو۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ریسرچ اسکالر میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہوگی کہ بغیر نگراں استاد کا سہارا لیے ہوئے تحقیق کو اپنے بل بوتے پر آگے بڑھا سکے گا۔ مواد کو صحیح طریقے پر مرتب کرنے اور پیش کرنے کی اہلیت پیدا ہو چکی ہوگی اور صحیح نتائج اخذ کرسکے گا۔ لہٰذا اس ڈگری کے لیے کوئی سپروائزر معین نہیں کیا جاتا۔

اس کی تھیسس لازماً پی ایچ۔ ڈی کے مقابلہ میں زیادہ بلند معیاری، زیادہ گہرائی اور گیرائی والی ہونا چاہیے۔ استدلال میں مضبوطی، اور نتائج زیادہ ٹھوس ہوں، انداز تحریر زیادہ

شگفتہ اور مسلسل و مربوط ہو۔ غرض اس کو ہر اعتبار سے پی ایچ ڈی کے مقابلہ میں زیادہ بلند اور معیاری ہونا چاہیے۔ اسکی تھیس کے ساتھ طالب علم اپنے پی ایچ ڈی کے کام کو بھی پیش کرتے تاکہ ممتحین اس کا فیصلہ کر سکیں کہ ریسرچ اسکالر نے کتنی ترقی کی ہے، نگاہ میں کتنی گہرائی پیدا ہوئی ہے کام میں کیا جدت ہے، تحقیق کو کتنا آگے بڑھایا ہو اور اس سے علم و ثقافت کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ مذکورہ بالا امور کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جاسکے گا کہ ریسرچ اسکالر ڈگری کا حقدار ہے یا نہیں۔

شخصیتوں اور واقعات کی تحقیق:- سائنس، فلسفے اور ریاضیات وغیرہ پر کام کرنے اور نئی دریافتیں کرنے میں جو کد و کاوش، عرق ریزی، اور محنت و تجربات کرنے پڑتے ہیں وہ تو معلوم ہی ہیں یہ بہ آسان سمجھا جاتا ہے کہ کسی مشہور فرد کی شخصیت اس کے کارناموں، یا کسی گذشتہ تاریخی واقعہ پر تحقیق کی جائے، کیوں کہ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں صرف مواد اکٹھا کرنا، منتشر اجزاء کو جمع کرنا، اور بس ان کو ترتیب سے پیش کر دینا ہے لیکن حقیقتاً یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا بعض طالب علم سمجھتے ہیں۔ اشخاص و واقعات پر کام بھی بہت ذمہ داری اور عرق ریزی کا متقاضی ہے کوئی واقعہ جو ابھی کسی قریبی جگہ گذرا ہو اس کو چند آدمی نقل کرتے ہیں تو ان کے بیان میں فرق نظر آتا ہے کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیکر بڑھا دیتے ہیں۔ اور کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ کوئی ایک جز کو دیکھتا ہے اور دوسرا جز اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اور کوئی کسی جز کو دیکھتا ہے، عمداً نہ سہی تو بھول چوک کا امکان ہے کبھی کسی فریق کی طرف داری یا مخالفت میں واقعے کو اس رنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ سننے والے کو ہمدردی یا مخالفت پیدا ہو جائے، یہ حال اس وقت ہے جب واقعہ قریبی زمانہ سے تعلق رکھتا ہو اور نقل کرنے والوں نے خود مشاہدہ کیا ہو، تو جب کسی واقعہ یا شخصیت کا تعلق گذشتہ زمانہ سے ہو اور ہم تک نقل در نقل سے حالات پہونچے ہوں، تو تغیر کے کتنے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں، یہ امکانات درمیان کے ہر راوی کے اعتبار

سے بڑھتے جاتے ہیں۔ لہذا اس سلسلہ میں روایت و درایت دونوں پر نظر رکھنے کی ضرورت
ہے، بیان کرنے والوں کا سلسلہ کیا ہے۔ سب قابل وثوق ہیں یا نہیں ان میں کچھ ایسے
تو نہیں جن سے جنبہ داری اور واقعات کو بڑھا چڑھا کر یا گھٹا کر پیش کرنے کا امکان ہو؟
آیا جو واقعات بیان کیے جا رہے ہیں وہ قرین قیاس بھی ہیں ——؟ جس شخص کے متعلق
ہیں اس کی عام افتاد مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کی عام مزاجی کیفیت
کے سلسلہ میں جو معلومات حاصل ہیں ان سے میل کھاتے ہیں یا نہیں؟ دیگر شہادتوں سے
متعارض تو نہیں؟ جس دور اور زمانہ سے متعلق ہیں خود اس دور سے مناسبت ہو یا نہیں؟
کسی شخص یا خاندان کے متعلق واقعات کا علم گھر والوں ہی سے بہتر طور پر ہو سکتا ہے جیسا
کہ مشہور ہے "اہل البیت ادری بما فی البیت" مگر یہاں بھی یہ امکان موجود ہے، کہ اپنے بزرگوں
اور خاندان کے حالات کو عام طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، خود نوشت سوانح عمریوں
پر بھی پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ممکن ہے اچھی باتوں کو ابھارا اور کمزور پہلوؤں
کو دبایا گیا ہو۔ دوسرے لوگوں نے جو حالات لکھے ہیں اس میں بھی یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جنبہ داری
کا امکان یا ذاتی اختلاف و چشمک تو نہ تھی، کبھی تاریخ مخصوص مفاد رکھنے والوں کے اشارہ
پر لکھی جاتی ہے اور مورخ کے قلم بکے ہوئے ہوتے ہیں۔ بظاہر لکھنے والے کو کوئی خاص عداوت
نہیں ہوتی لیکن اس کا قلم ترجمان ہوتا، ان کا جن کے اشارے پر تاریخ مرتب کر رہا ہے گذشتہ
شخصیتوں اور واقعات کے سلسلے میں اگر زمانے کا فاصلہ زیادہ ہو تو مکتوبات ہی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے
مگر مشکل یہ ہے کہ اصل مکتوبات ریسرچ اسکالر تک بہت کم پہونچ پاتے ہیں۔ یہ نقل در نقل کی
منزلوں سے گذرتے ہوئے اس تک پہونچتے ہیں اور ہر نقل میں سہو و نسیان کی بنا پر تبدیلی کی
گنجائش ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ صرف ایک نسخہ پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ دیگر نسخوں سے بھی
مقابلہ کر لیا جائے، مصنف کے زمانہ سے قریب تر نسخے یا اصل نسخے سے نقل شدہ نسخے ورنہ جن
میں وسائط کم تر ہوں ان پر زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے گر چونکہ اصل نسخے سے منقولہ نسخے میں

بھی کتابت کی غلطی کا امکان ہے، بلکہ یہ امکان تو خود مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے
میں بھی موجود ہے لہٰذا اشتباہ کے مواقع پر، سیاق و سباق عبارت دیکھ لینا ضروری ہے،
ایسا بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوا ہے کہ کتاب کسی کی لکھی ہوئی ہو اور منسوب دوسرے کی طرف ہوگئی
ہو لہٰذا یہ بھی جانچ لیا جائے کہ تصنیف اس شخص کی ہے بھی یا نہیں، جس کی طرف منسوب ہے،
جس کا پتہ مصنف کی دیگر کتابوں کے طرز نگارش اور انداز بیان سے بھی چلایا جاسکتا ہے۔
کبھی کتاب کا گہرا مطالعہ کرنے سے خود کتاب ہی میں ایسے ثبوت مل جاتے ہیں جو بتا دیتے ہیں کہ
نسبت غلط ہے، مثلاً کسی ایسے واقعہ کا ذکر مل جائے جو بعد کے زمانے کا ہے تو یہ ثبوت ہوگا کہ
بعد کی تصنیف ہے اور جس کی طرف نسبت دی گئی ہے غلط ہے۔

ریسرچ کون کرے؟

ریسرچ کے ارادے سے پہلے طالب علم کو اپنی جگہ یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ کیا وہ
اس میدان کا مرد بن سکتا ہے؟ کیوں کہ اس کے لیے صرف محنت کافی نہیں ہے۔ سعی و
کوشش سے مواد اکٹھا کیا جاسکتا ہے، اس کی مدون اور مرتب کیا جاسکتا ہے، لیکن
کامیاب تھیس کے لیے بس اتنا ہی کافی نہیں بلکہ طالب علم کا ذہن ایسا منطقی ہونا چاہیئے
کہ مقدمات کی صحیح ترتیب قائم کرے اور ان سے درست نتیجے نکالے، بات میں بات پیدا
کر سکے اور خود ہی نئے سوالات ڈھونڈھے اور ان کا حل تلاش کرے۔

محقق کو اندھا مقلد نہ ہونا چاہیے، جو دوسروں کی رائے سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں،
وہ تحقیق کا کام نہیں کر سکتے، اس میں اتنی ہمت ہونا چاہیے کہ بڑی سے بڑی شخصیت کے اقوال
آراء کو ٹھونک بجا کر پرکھ سکے، اور من قال پر ما قال پر نظر رکھے۔

معلوم نہیں کتنے ایسے نظریے ہیں جو بڑے بڑے فلاسفر و علماء نے اختیار کیے تھے۔
ایک زمانہ ان کو مانتا رہا، لیکن بعد کے محققین نے ان کو الٹ پلٹ دیا۔

اسکالر میں تلاش وجستجو کا ذوق وشوق، بدرجۂ اتم ہو انتھک کوشش کرسکتا ہو۔
منزل تک پہنچے بغیر تھک کر راہ میں ہی بیٹھ نہ جائے۔
مزاج میں صبر و برداشت کا مادہ ہونا چاہیئے کبھی کبھی بڑی تلاش اور کد وکاوش کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، سعی رائیگاں جاتی ہے۔ ایسے موقع پر دل برداشتہ ہو کر تحقیق سے دست کش نہ ہو جائے۔

اسلامی موضوعات

اسلام سے متعلق تین اہم اور بنیادی موضوع ہو سکتے ہیں۔ جن پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔
(۱) عقائد ونظریات، (۲) فقہی مسائل، (۳) شخصیتوں اور واقعات سے بحث۔
عقائد ونظریات میں محدثین واشاعرہ کے نزدیک بحث کے بنیادی ارکان کتاب و سنت و اجماع ہیں۔ معتزلہ و امامیہ، ان میں عقل کو بھی داخل سمجھتے ہیں، محدثین کو خاص طور پر اس پر اصرار ہو کہ، قرآن و حدیث میں جو کچھ وارد ہے اس کو جوں کا توں، بغیر اپنی عقل آرائی کے قبول کر لیا جائے۔ اسلامی تاریخ میں پورا ایک دور ایسا ملتا ہے، جس میں الفاظ نصوص پر جمود کرنے والوں اور عقل و صرف عقل پر اعتماد کرنے والوں میں زبردست معرکہ آرائی رہی ہے۔ جس میں صرف زبان و قلم اور ادلہ و براہین کے ہتھیاروں ہی سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ قتل و خونریزی اور قید و بند کی نوبتیں بھی آئی ہیں، سلاطین اسلام کبھی ایک گروہ کی طرف جھک کر دوسرے کو بزور قوت دبانا چاہتے تھے، اور کبھی دوسرے کے حامی بن کر پہلے پر سختیاں کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے نظریات میں حد سے متجاوز ہیں عقل کو بالکل طلاق دینا بھی ممکن نہیں کیوں کہ یہی وہ جوہر ہے جس کی بنا پر انسان انسان بنا اور اشرف المخلوقات قرار پایا۔ اگر یہ بیکار ہوتی تو قرآن مجید "ما لکم کیف تحکمون" "افلا یتدبرون۔ افلا یعقلون" کہہ کر سوچنے،

سمجھنے، اور عقل کو کام میں لانے کی طرف متوجہ نہ کرتا۔ اگر صرف تقلیدی مذہب جائز ہوتا تو وہ لوگ جو اپنے آباؤ اجداد کے دین پر آنکھ بند کر کے عمل پیرا تھے ان پر قرآن کیوں یہ طنز کرتا،

انھوں نے اپنے ماں باپ کو گمراہ پایا یہ بھی انھیں کے نقش قدم پر (بے سوچے سمجھے) دوڑے چلے جارہے تھے انا وجدنا اباءنا علی امة وانا علی اثارهم مقتدون "ہم نے اپنے ماں باپ کو ایک مسلک پر پایا ہے اور ہمارے لیے یہی بات صحیح ہے کہ ہم ان کی پیروی کرتے رہیں۔ احادیث میں عقل کو بڑی اہمیت دی گئی ہے لہٰذا عقل سے قطع تعلق کر لینا صحیح قرار نہیں پاتا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی ہر طاقت وصلاحیت کی طرح اسکی عقل بھی محدود ہے اور اس کی جولان گاہ کے بھی مخصوص میدان ہیں، جس طاقت پر بھی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے وہ جواب دے جاتی ہے، زیادہ وزن اٹھانے سے ہاتھ جھول جاتا ہے، زیادہ دوڑنے سے انسان گر جاتا ہے، تیز روشنی سے آنکھ لڑانے پر جو نظر آتا تھا وہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یوں ہی اگر عقل پر بھی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ بھی جواب دے جائے گی اور نادانی وجہالت کی طرف پلٹ جائے گی یقیناً عقل ہی فیصلہ کرتی ہے، کہ خالق کائنات کے بارے میں سوچا جائے یا نہیں، عقل ہی اس بارے میں حکم قرار دی جاتی ہے، کہ اس نظم کائنات کا کوئی منتظم ہے یا نہیں، عقل سے ہی پوچھا جائے گا کہ خالق ومنتظم کائنات کو حکیم وعلیم وقدیر ہونا چاہیے یا نہیں، یہ بھی عقل ہی بتائے گی۔ اس پر بھی انسان کو غور کرنے کا حق ہے کہ اس کی اصلاح اور درستی کے لیے اللہ کی طرف سے کسی مصلح ورہنما مقرر کرنے کی حاجت ہے یا نہیں، یہ بھی عقل ہی بتائے گی کہ مصلح کی صفات کیا ہونا چاہیے؟ اور اسکی صداقت کو کیوں کر پرکھنا چاہیے، لیکن یہ بات درست نہ ہوگی کہ وہی تسلیم کریں گے جو ہماری عقل بتائے، جہاں وہ نفی واثبات میں فیصلہ نہ کرے اسے تسلیم نہ کریں گے۔ نبی کی عصمت وصداقت پر بھروسہ

کر کے ایسی باتوں کو تسلیم کرنا جہاں عقل خاموش ہو جیسے ملائکہ وجنت ونار کا وجود، روز جزا کی جزئیات وغیرہ، خلاف عقل نہیں، بلکہ عقل ہی کے فیصلے کو ماننا ہے کیوں کہ نبی کے دروازے تک جس کی بات پر اعتماد کیا جا رہا ہے عقل ہی نے پہونچایا ہے، ہاں اگر کوئی بات دلیل نقلی میں ایسی ملے جو عقل قطعی کے منافی ہو جیسے بعض آیات میں، اللہ کے لیے وجہ (چہرہ) ید (ہاتھ) استوی علی العرش (عرش پر بیٹھنا) وغیرہ کا استعمال ہو جن کا لازمہ جسمانیت ہے، اور جو عقل کے قطعی فیصلہ کے منافی ہے۔ وہاں ایسے ہی معنی مراد لینا چاہیئے، جس سے یہ الفاظ عقل سے متعارض نہ رہیں۔

۲۔ **فقہی مسائل**:۔ اسلام صرف چند عقائد ہی کو تسلیم کرنے کا نام نہیں بلکہ انسان کو اک ــــــ خاص ڈھنگ اور انداز کی زندگی بسر کرنے کا پابند کرتا ہے، کچھ ذمہ داریاں اور فرائض عائد کرتا ہے اور کچھ باتوں سے روکتا ہے، کچھ باتیں پسندیدہ ہیں۔ (جو اس حد تک نہ ہوں کہ واجب ہو جائیں تو مستحب) اور کچھ ناپسند ہیں (اگر حرمت کی حد تک نہ ہوں تو مکروہ) انسان کے بعض اقدامات، کو صحیح قرار دیا گیا ہے اور کچھ کو باطل کہا گیا ہے، افعال انسانی کی جن سے کسی حکم شرعی کا تعلق ہوتا ہو حسب ذیل قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں:۔

(۱) عبادات، (۲) شخصی افعال، (۳) ایقاعات، (۴) معاملات۔

عبادات:۔ وہ افعال جن کی صحت قصد قربت اور رضائے خدا کے لیے بجا لانے پر موقوف ہو، اس طرح کے، کل افعال تمام مسلمانوں کے نزدیک توقیفی ہیں۔ یعنی ان کے اجزاء و شرائط و انداز میں اپنی طرف سے اضافے، کمی یا تغیر کا حق نہیں ہے۔ اتنے ہی پر اکتفا کی جائے گی۔ اور اسی طرح انجام دیئے جائیں گے۔ جس طرح شریعت میں وارد ہیں۔ ان میں اپنی طرف سے ایجاد اضافہ، کمی، یا تبدیلی، تشریع اور بدعت محرمہ ہے، ہاں تعلیل بعد الورود میں کوئی حرج نہیں، یعنی اپنی عقل سے کسی عمل کو عبادت قرار دینا، یا کسی بات کو جزء یا شرط وغیرہ قرار دینا تو جائز نہیں، لیکن شریعت سے کسی عبادت کے ثابت ہو جانے

کے بعد عقل یہ تلاش کر سکتی ہے کہ اس میں کیا کیا فائدے اور کیا مصالح ہو سکتے ہیں۔ مگر ختم و جزم سے یہ نہ کہا جائے، کہ یہی اسباب اس کو عبادت قرار دینے کے ہیں۔

اسلامی شریعت نے ان مواقع کے لیے جب کسی عمل کے بجالانے میں زحمت کا امکان ہو خود گنجائش رکھی ہے۔ مثلاً سفر یا خوف کے موقع پر نماز کا قصر ہو جانا، کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر نماز کا ادا ہونا، راستہ خطرناک ہونے پر حج کا ساقط ہو جانا۔ بیماری کی حالت میں روزے کا ساقط ہو کر بعد میں ادائیگی واجب ہو جانا وغیرہ، بہرصورت یہ تحقیق کہ کون سی عبادت کس حالت میں کس طرح بجالائی جائے گی، اور کب ساقط ہو گی، صرف سمعی دلیلوں پر موقوف ہے۔ ہاں عقل نے اتنا ضرور بتا دیا۔ کہ جب کسی حکم کے بجالانے کا قطعی امکان نہ رہے تو وہ حکم ساقط ہو جائے گا اور جس کی تائید خود قرآن مجید بھی کرتا ہے۔

شخصی افعال:۔ اس سے مُراد وہ اعمال ہیں جن کے بجالانے میں قصد تقرب یا صیغے کی حاجت نہ ہو جیسے، کھانا، پینا، آنا جانا وغیرہ۔

ایقاعات:۔ وہ امور جن کے واقع ہونے میں صیغے کی ضرورت تو ہو مگر قبول کی ضرورت نہ ہو یعنی یک طرفہ ہوں، جیسے طلاق، عتق، اور وقف وغیرہ۔

معاملات:۔ جن میں طرفین معاملہ دو فرد ہوں، ایک کی طرف سے ایجاب ہو اور دوسرے کی طرف سے قبول (چاہے یہ ایجاب و قبول الفاظ سے ہونا ضروری ہوں یا خود فعل ہی کا ایجاب و قبول کے لیے کاشف ہونا کافی ہو) جیسے نکاح اور خرید و فروخت وغیرہ۔

شخصی افعال:۔ عبادت کے علاوہ بھی اسلام میں بہت سی باتیں واجب یا حرام ہیں۔ مثلاً ماں باپ کی اطاعت، زوجہ کا نان و نفقہ، امانتوں کا واپس کرنا واجب۔ جھوٹ بولنا کسی کا مال غصب کرنا، اور چوری کرنا حرام ہے۔ عبادات اور ان واجبات میں فرق یہ ہے کہ اگر ان کو بقصد قربت بجالائے گا۔ تو ثواب بھی ہو گا۔ اور اگر یہ قصد نہ ہو، تو وہ ذمہ داری

جو شریعت کی طرف ڈالی گئی تھی ادا ہو جائے گی اور کوئی باز پرس نہ ہو گی۔ اسی طرح فعل حرام کو اگر رضائے الٰہی کے لیے ترک کرے گا تو ثواب بھی ملے گا۔ اور اگر یہ نیت نہ بھی ہو تب بھی ترک حرام کے بعد کوئی گناہ نہ ہو گا۔ آیات و روایات سے یہ بات ثابت ہے اور عقل بھی بتاتی ہے، کہ اگر کسی فعل کے واجب یا حرام ہونے کی دلیل شرعی موجود نہ ہو تو اس کو مباح قرار دیا جائے گا

مواقع شک اگر کسی موقع پر حکم شرعی کے متعلق شک ہو تو اسکی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) اصل تکلیف مشکوک ہو۔ یعنی اس بات میں شک ہو کہ اس وقت ہم سے اللہ کا کوئی حکم متعلق ہے یا نہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) حالت سابقہ معلوم، یعنی یہ معلوم ہو کہ اس شک سے قبل ہمارے ذمہ کیا حکم شرعی تھا، تو جو پہلے حکم تھا، وہی اب بھی یعنی حالت شک میں باقی رکھا جائے گا۔ مثلاً اس میں شک ہے کہ غیبت امام میں نماز جمعہ واجب ہے یا نہیں لیکن غیبت امام سے قبل یہ واجب تھی۔ (تو اگر کوئی غیبت امام میں عدم وجوب کی دلیل موجود نہ ہو) تو پہلے ہی حکم کو اب بھی باقی سمجھا جائے گا یا مثلاً کسی گلاس میں جو پانی ہو اس کے متعلق یقین ہو کہ کل یہ نجس تھا آج شک ہو کہ اب بھی نجس ہے یا نہیں، تو پہلے والے حکم نجاست کو باقی سمجھا جائے گا۔ اس کو استصحاب کہتے ہیں۔

(ب) شک سے پہلے کیا حکم تھا معلوم نہ ہو مثلاً اس میں شک ہے کہ تمباکو کا استعمال شریعت میں جائز ہے یا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ پہلے کیا حکم تھا۔ ایسے موقع پر یہی سمجھا جائے گا کہ حرام نہیں ہے۔ اس دلیل کو (اصالت برائت کہتے ہیں)

(۲) اصل تکلیف معلوم ہو۔ یعنی یہ پتہ ہو کہ شریعت کی طرف سے ہمارے ذمہ ایک حکم ہے، مگر مکلف یہ ہیں شک ہو یعنی یہ پتہ نہ ہو کہ اس حکم کا تعلق کس امر سے ہے، یا یہ تو پتہ ہے کہ کوئی حکم ہے لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ وہ حکم کیا ہے، مثلاً یہ تو معلوم ہے کہ غیبت امام میں جمعہ کے

روز نماز ہم پر واجب ہے اس میں شک ہو جائے کہ وہ نماز جمعہ ہے یا نماز ظہر ہے اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) جن میں حکم مردد ہو یا جو حکم مردد ہو اس میں احتیاط ممکن ہے یا نہیں، مثلاً اگر شک وجوب میں ہے تو دونوں کو جمع کر سکتا ہے کہ نہیں، اگر جمع کر سکتا ہے تو احتیاط کرنا چاہیے مثلاً مذکورہ بالا مثال میں نماز ظہر اور جمعہ دونوں کو بجا لائے، (اس دلیل کو اصالت احتیاط کہتے ہیں)

(ب) مذکورہ بالا صورت میں احتیاط ممکن نہ ہو یعنی دونوں کا جمع کرنا وجوب کی صورت اور دونوں کا ترک کرنا حرمت کی صورت میں ممکن نہ ہو یا تردد ایک ہی شئے میں ہو کہ وہ واجب ہے یا حرام تو ایسے موقع پر اختیار ہے کہ ان میں سے کسی ایک بات کو جسے چاہے اختیار کرے۔ یا بقصد وجوب اختیار کرے یا بقصد حرمت ترک کر دے، اس کو (اصالت تخیر کہتے ہیں۔)

واجبات و محرمات میں تو پوری دقت نظر سے کام لیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ دلیل مستحکم اور قابل قبول ہے یا نہیں لیکن مستحبات و مکروہات میں زیادہ دقت نہیں کی جاتی ۔ان کی دلیل اگر ویسی مستحکم نہ ہو جیسے حرمت و وجوب کے لیے ہونی چاہیے تب بھی مستحب یا مکروہ سمجھ کر بجا لایا یا ترک کیا جا سکتا ہے جس کو تسامح فی ادلۃ السنن کہتے ہیں کیونکہ اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ اگر کسی ایسے کام کو جو واقعاً اللہ کو پسند یا ناپسند نہ ہو، پسند یا ناپسند سمجھتے ہوئے نیت تقرب سے بجا لائے تو اللہ ثواب سے محروم نہیں کرے گا۔ (یہ ثواب بظاہر نیت عمل کی بنا پر ہے۔)

ایقاعات و معاملات اور ان کی بنا پر پیدا ہونے والے حقوق کے متعلق دیکھنا پڑے گا کہ شریعت نے کن معاملات و ایقاعات کی اجازت دی ہے اور ان سے کیا حقوق حاصل ہوتے ہیں، کس کس طرح کی شرطوں کی اجازت دی ہے اور کیسی شرطیں درست قرار نہیں دی

ہیں، ایسے جدید معاملات جو زمانۂ رسولؐ اور آئمہ علیہم السلام میں رائج نہ تھے اور بعد میں رائج ہوئے ہیں جیسے بینکنگ سسٹم، پگڑی، لاٹری اور بیمہ وغیرہ ان کے متعلق دیکھنا پڑے گا کہ یہ کن معاملات کے ذیل میں آتے ہیں۔ اگر ان میں آسکتے ہوں جن کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے، تو یہ بھی جائز قرار پائیں گے اور اگر ان معاملات میں شامل ہوتے ہوں جو حرام قرار دیئے ہیں تو ان پر بھی حرمت کا حکم آجائے گا۔ اس موقع پر محقق کی مہارت اور اسکے مجتہدانہ ذہن کا اندازہ لگایا جائے گا کہ وہ ان کے ہر ہر پہلو پر نظر کرکے کس طرح تجزیہ کرتا ہے اور اس میں کیسی قوتِ استدلال پائی جاتی ہے۔

اسلامی مسائل کے مصادر

قرآن مجید :۔ اسلامی احکام و مسائل کے سمجھنے کے لیے سب سے مقدم اور بنیادی حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے۔ نصوص و احکام قرآن تمام مسلمانوں کے نزدیک بلا اختلاف حجت ہیں۔ کیونکہ قرآن کے متعلق مسلمانوں میں یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اگر کوئی اس بات سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ خدا کے کلام میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں جیسا کہ خود قرآن فرما رہا ہے ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ومن خلفہ

اخباریین ظواہر کتاب کو اس وقت تک حجت نہیں تسلیم کرتے جب تک کسی معصوم سے تفسیر اور توضیح نہ مل جائے۔ ان کی دلیل اس قسم کی کثیر روایات ہیں جن میں اپنی رائے سے تفسیر کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے قتادہ سے کہا! کیا تم فقیہ اہل بصرہ ہو، انھوں نے کہا لوگ یہی خیال کرتے ہیں
امام نے فرمایا میں نے سنا ہے تم قرآن کی تفسیر بھی کرتے ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں تفسیر تو کرتا ہوں۔ امام نے اس کے جواب میں جو فرمایا اس میں یہ بھی ارشاد کیا۔ اے

قتادہ اگر تم قرآن کی تفسیر اپنے دل سے کرتے ہو تو خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا، اور اگر لوگوں سے سنی سنائی تفسیر کرتے ہو تب بھی یہی صورت ہے۔ قرآن تو بس وہی جانتا ہے جس سے قرآن کا خطاب متعلق ہے۔

لیکن تفسیر بالرائے جس کی روایات میں ممانعت کی گئی ہے، اس کا مطلب ہے اپنے خیالات و تصورات کے مطابق قرآنی آیات کو ڈھالنا، ماحول کے اثرات باطنی دسیلے سے جو نظریے قائم کر لیئے ہوں قرآن مجید کی آیات کو توڑ مروڑ کر انھیں پر حمل کرنا۔ لہذا قرآنی الفاظ سے ان معنوں کا مراد لینا جن کا عرف یا لغت سے پتہ چلتا ہو، یا قرائن حالیہ و مقالیہ جن معنوں کو ترجیح دیتے ہوں انکو تفسیر بالرائے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

سنت :- قرآن مجید کے بعد احکام اسلامی کا دوسرا اہم ترین ماخذ سنت ہے۔ سنت کے لغوی معنے سیرت اور طریقہ کے ہیں، چاہے یہ سیرت پسندیدگی کے قابل ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے :- من سن سنۃً حسنۃً فلہ اجر من عمل بھا الی یوم القیامہ ومن سن سنۃ سیئۃ کان علیہ وزر من عمل بھا الی یوم القیامۃ "جو شخص اچھی سیرت قائم کرے اس کو ان تمام لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر قیامت تک عمل کرتے رہیں، اور جو کوئی برا طریقہ رائج کرے اس پران تمام لوگوں کا بھی بوجھ ہوگا جو قیامت تک اس پہ عمل کریں۔ ان حدیث شریف میں اچھے اور برے دونوں طریقوں کو سنت کہا گیا ہے۔

شرعی اصطلاح میں :- سنت ہر اس بات کہتے ہیں جو رسول سے قول[۱]، فعل[۲] یا تقریر[۳] کی صورت میں نقل کی گئی ہو۔

۱۔ اقوال نبی :- قول نبی سے مراد رسالتمآب کی وہ احادیث ہیں جو مختلف مواقع پر آپ سے نقل کی گئی ہیں، رسول کے اقوال کے حجت ہونے میں کسی مسلمان کو شک نہ ہونا چاہیئے کیونکہ قرآن مجید نے متعدد جگہ آپ کی اطاعت کا بلا شرط اور بغیر کسی قید کے حکم دیا ہے، جس

سے نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول کا ہر حکم تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ یہاں تک ارشاد ہے "ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" رسولؐ اپنی خواہش نفس سے کلام ہی نہیں کرتے، وہ تو بس اللہ کی وحی ہوتی ہے جس کو پہنچا دیتے ہیں۔ آپ پہ وحی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو وہ جس کی تلاوت کرنا ضروری ہے اور جو بطور معجزہ ہے وہ قرآن ہے، اور دوسری وہ جس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور نہ بطور معجزہ ہے۔ وہ حدیث ہے۔

ب۔ افعال رسولؐ :۔ رسالتمآبؐ کے افعال تین طرح کے ہوتے تھے بعض وہ فطری افعال جو رسول کی طرح دوسرے انسان بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ جیسے کھانا، پینا سونا، جاگنا وغیرہ ان افعال کے جائز ہونے میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں (بشرطیکہ حرمت یا وجوب کا کوئی سبب علاحدہ سے نہ ہو جائے جیسے دوسرے کے مال کا کھا جانا یا اس طرح کھانے کا ترک کرنا کہ ہلاکت کا خوف ہو جائے۔

دوسرے وہ اعمال جو عبادت سے متعلق ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ جن میں قصد قربت شرط ہے جن کے متعلق قرآن مجید میں صرف اجمالی آیات ہیں۔ ان کی توضیح و تشریح، جس طرح قول رسولؐ سے ہوتی ہے اسی طرح عمل رسولؐ بھی ان کی تشریح کرتا ہے۔ جیسا کہ خود رسالتمآبؐ نے فرمایا ہے:۔ صلو کما رایتمونی اصلی" یا ارشاد فرمایا ہے:۔ "خذو منی مناسککم" مناسک حج کا علم مجھ سے حاصل کرو۔ قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں جس طرح رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح آپ کی اتباع اور پیروی کے لیے بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"۔ "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" اتباع اور تاسی دونوں عمل کی پیروی کو کہتے ہیں۔

تیسرے معاملات یعنی عقود و ایقاعات۔ جیسے بیع و شراء و نکاح وغیرہ جن میں قصد قربت شرط نہیں ہے۔ جو معاملہ رسولؐ نے کیا بلاشبہ وہ جائز و حلال ہے اس طرح اگر کسی معاملہ کے متعلق قول و عمل سے ناراضگی کا اظہار کیا وہ ناجائز ہے۔

ج۔ تقریر رسول:۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ رسالتمآب کسی مسلمان کو کوئی کام کرتے دیکھیں اور اس کو ناپسند نہ کریں۔ یہ تقریر بھی حجت ہے کیونکہ نہی عن المنکر جب عام مسلمان پر واجب ہے تو رسول کی تو غرض بعثت ہی یہی ہے کہ اچھی باتوں کا امر فرمائیں اور بُری باتوں سے روکیں، کوئی عمل رسول کے سامنے کسی مسلمان نے کیا اور آپنے روکا ٹوکا نہیں تو یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ عمل شرعاً جائز تھا۔

رسول کی سنت کا مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے کسی صورت کے مطابق بھی واقع ہو، حجیت ہونا تمام مسلمانوں میں اجماعی ہے۔ قرآن مجید میں بھی متعدد آیات سے اسکی حجیت ثابت ہے، کسی آیت میں ارشاد ہے:۔ "ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا" جو رسول تم کو دیں اس کو لے لو، اور جس بات سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔ اگرچہ آیت فئ کے ذکر میں وارد ہوئی ہے، لیکن چونکہ مورد مخصص نہیں ہوتا لہذا اس کا تعلق صرف مال دنیا سے نہیں ہے، بلکہ تمام وہ علوم اور احکام جو رسولؐ سے حاصل ہوں وہ سب آیت کے دامن میں شامل ہوں گے۔ الحاصل سنت رسول کا حجت ہونا ضروریات دین میں شامل ہے، اور سنت سے انکار کے بعد دین اسلام کے کوئی معنے ہی نہیں رہ جاتے، نماز روزہ، حج، زکوٰت۔ غرض تمام اصول و فروع دین کی تعیین و تخصیص صرف سنت ہی سے ہوتی ہے کیوں کہ قرآن نے تو ہر منزل میں صرف اجمال سے کام لیا ہے۔

سیرت صحابہ:۔ بعض علماء اسلام نے سیرتِ صحابہ کو بھی سنت رسولؐ کا درجہ دیا ہے، لیکن علامہ ابن حزم نے ان کی دلیلوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ:۔ اما قولہ تعالےٰ "وشاورھم فی الامر" وقولہ تعالیٰ:۔ "امرھم شوریٰ بینھم" فان کل مخالف و

موالف لا یمتری ان ذالک لیس فی شرع من الدین الخ۔ اصحاب رسولؐ کے متعلق یہ آیت کہ ان سے مشورہ کرو، یا ان کے آپسی معاملات مشورے سے ہوا کرتے تھے۔ تو ہر موافق و مخالف جانتا ہے کہ اس مشورے کا دین کی تشریع سے کوئی تعلق نہیں، اور اگر کوئی شخص کہے کہ :۔ نماز رائے مشورے سے فرض کی گئی، یا کہ روزہ حج یا دین کی کوئی بات مشورے سے ہوئی تو ایسا شخص جھوٹا بہتان لگانے والا اسی کے ساتھ کافر ہے، دوسروں کے مشورے سے دینی امور کو کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، حالانکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب "قل ارأیتم ما انزل اللہ لکم من رزق فجعلتم منہ حلالا وحراما قل اللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون" ان آیات میں اپنی طرف سے کسی شئی کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینا اللہ پر افترا اور بہتان قرار دیا گیا (۱) اگر سیرت صحابہ کو سنت نبویہ کا درجہ حاصل ہوتا تو حضرت علی بن ابی طالب شوریٰ کے موقع پر سیرت کی شرط کو رد نہ فرماتے ظاہر ہے کہ تمام اصحاب رسول ایک درجہ کے نہ تھے ان سے غلطیوں کا ہونا ناقابل انکار ہے جمل اور صفین کی لڑائیوں میں دونوں طرف اصحاب رسول کا ہونا مسلم ہے ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک گروہ یقیناً غلطی پر تھا، اور اس پر تو تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ معصوم نہ تھے۔

سنت اہلبیت : شیعہ حضرت علی اور ان کی اولاد کے گیارہ اماموں کو رسالتمآب ہی کی طرح ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ سے معصوم قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ان اماموں کا قول فعل اور تقریر اسی طرح حجت ہے جیسے رسول کی سنت حجت ہے۔ شیعہ بعض قرآن کی آیات اور احادیث پر استناد کرتے ہوئے سنت اہلبیتؑ کی حجیت کے قائل ہیں مثلاً قرآن مجید میں اہلبیت کے لیے ارشاد ہے: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا شیعوں کے نزدیک اذہاب رجس اور تطہیر سے اہلبیت کا ہر گناہ و معصیت سے پاک رکھنا

مراد ہے۔ لہٰذا جب وہ معصوم ہیں تو ان کا بھی ہر قول و فعل اور تقریر حجت ہوگی، کیوں کہ رسول کی سنت بھی ان کی عصمت ہی کی وجہ سے حجت قرار پاتی ہے۔

رسول کی بعض مشہور و معروف حدیثوں سے بھی شیعہ آئمہ اہلبیت اور ان کی سنت کے حجت ہونے پر استدلال کرتے ہیں مثلاً رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے: "انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھلبیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی" اس حدیث شریف میں جہاں قرآن سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے، وہیں اہلبیت سے بھی تمسک کا حکم ہے جس سے پتہ چلا کہ جس طرح قرآن میں غلطی کی گنجائش نہیں اسی طرح اہلبیت سے بھی غلطی کا امکان نہیں۔

یا ایک دوسری مشہور حدیث میں ارشاد رسول ہے: "مثل اھل بیتی فیکم کسفینۃ نوح، من رکبھا نجا، ومن تخلف عنھا غرق وھوی" ظاہر ہے کہ رکوب سفینہ سے مراد یہی ہے کہ اصول دین و فروع دین میں جو ان پر اعتماد کرے گا وہ نجات پائے گا، اور جو ان کو چھوڑ کر دوسرے کا سہارا لے گا، اس کی مثال پسر نوح کی سی ہوگی جس نے ایک پہاڑ کا سہارا لیا تھا مگر وہ ہلاکت سے بچ نہ سکا تھا۔

الغرض شیعہ مختلف سمعی اور عقلی دلیلوں کی بنا پر آئمہ معصومین کی سنت کو بھی دینی امور میں اسی طرح حجت قرار دیتے ہیں جیسے رسول کی سنت حجت ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اہلبیت کو حلال خدا کے حرام کرنے، یا حرام خدا کے حلال کرنے کا حق تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسالتمآبؐ اپنے زمانہ میں احکام خدا کے مفسر اور مبین تھے، اسی طرح اہلبیتؑ رسالتمآبؐ کے وارث علم ہونے، اور الہام کی صلاحیت رکھنے کی بنا پر اپنے اپنے زمانہ میں خدائی احکام کے مفسر اور بیان کرنے والے تھے۔

۳۔ اجماع:- اجماع کے معنے لغت میں کسی امر پر اتفاق کرنے کے آئے ہیں۔ اور انھیں لغوی معنوں کی مناسبت سے اصطلاحی معنے قرار پائے ہیں۔

اجماع کے اصطلاحی معنے:- اجماع کی تعریف میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی:- مسلمانوں کے اہل حل و عقد کا کسی امر پر اتفاق کرنا (شیخ التہذیب) دوسری تعریف یہ کی گئی ہے:- امت محمدیؐ کے مجتہدین کا کسی ایک زمانہ میں کسی حکم شرعی پر اتفاق کرنا۔ بظاہر دونوں تعریفوں میں صرف لفظوں کا فرق ہے مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ اہل حل و عقد سے مراد ———— ، جن کو امور دین میں حل و عقد کا حاصل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مجتہد ہی ہو سکتے ہیں یوں نہیں اجماع میں بعثت رسولؐ سے لے کر قیامت تک کے لوگوں کا قول تو دیکھا نہیں جائے گا، لہذا "فی عصر" کسی ایک زمانہ کی قید بھی ملحوظ ہے، اسی طرح اس اجماع کا تعلق بھی حکم شرعی ہی سے ہونا چاہئے کسی منطق یا فلسفہ کے مسئلہ پر اتفاق کا تعلق دین سے کیا ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے صرف اہل مکہ و مدینہ کے اتفاق کو اجماع قرار دیا ہے۔ امام مالک صرف اہل مدینہ کے اتفاق کو اجماع قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگ تو صرف شیخین کے اتفاق کو اجماع تسلیم کیا ہے۔ لیکن یہ آخری اقوال کسی بنیاد پر بھی قابل قبول نہیں قرار پاتے۔ مکہ اور مدینہ کے علماء میں کیا خصوصیت ہے کہ ان کا اجماع تو معتبر قرار پائے اور دوسرے شہروں کے اہل علم چاہے کتنا ہی بلند پایہ رکھتے ہوں ان کو پوچھا بھی نہ جائے۔ ہاں یہ اس دور کے لیے ایک حد تک کہا جا سکتا تھا جب اہل حل و عقد مدینہ مکہ ہی کیا منحصر تھے۔ امام مالک سے کہا جا سکتا ہے کہ وہی علماء جو مدینہ میں مقیم ہوں جب تک مدینہ میں رہیں ان کا قول معتبر ہے اور اگر مدینہ سے منتقل ہو کر کسی دوسرے شہر میں بس جائیں تو وہ بے وقعت ہو جائیں، اسکی کیا وجہ ہے۔

اسی طرح جبکہ شیخین میں یا جماع اسلام کوئی بھی معصوم نہیں تو ان کے قول و عمل کو کیوں حجت قرار دیا جائے جبکہ خلفاء راشدین میں سے ایک یعنی حضرت علیؑ ان کی سیرت کو رد بھی کر چکے ہیں۔ ہاں کل خلفاء راشدین کا کسی امر پر اتفاق (جیسا کہ بعض لوگوں نے تعریف

کی ہے) تو شیعوں کے نزدیک حجت ہو سکتا ہے کیوں کہ قول معصوم کی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

اجماع کی سند میں جو حدیث رسول پیش کی جاتی ہے وہ بھی صرف پہلی ہی تعریف کی تائید کرتی ہے کہا جاتا ہے کہ رسالتمآب نے ارشاد فرمایا ہے: "لا تجتمع امتی علی الخطاء۔۔ او علی الضلال" رسول نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت خطا، گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مسلمانوں نے مختلف ممالک اور دور دراز کے شہروں میں متفرق ہونے کے بعد حاصل ہونا عملاً ممکن نہیں ہے۔ کون ہے جو ہر ہر شہر کے کونے کونے میں جا کر تحقیق کرے کہ کون لوگ اہل حل عقد قرار پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ کن فتاوی پر متفق ہیں اور ہر تلاش و جستجو کے بعد بھی اس کی کیا دلیل ہوگی کوئی غیر مشہور شخص جو صلاحیت اجتہاد رکھتا ہو کسی کونے میں نہیں رہ گیا جس کا قول معلوم نہیں کیا جا سکا۔

شیعہ اور اجماع:۔ اگرچہ شیعوں کی کتابوں میں بھی اجماع کا دعویٰ اکثر ملتا ہے، لیکن جب حجت اجماع کی دلیلوں کو دیکھا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک صرف اتفاق کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اگر تمام امت کسی امر پر مجتمع ہو جائے تو وہ اس لیے حجت ہے کہ جب تمام امت مجتمع ہو جائے گی تو رئیس امت یعنی امامؑ بھی ان میں شامل ہوگا، اور چونکہ وہ معصوم ہے لہذا اس کی عصمت غلطی اور خطا سے حفاظت کی ذمہ دار ہوگی، اور اگر امام شامل نہیں ہے، تو یہ کہنا درست نہیں کہ تمام امت یا امت کے تمام اہل حل و عقد نے اتفاق کر لیا ہے۔ اس دلیل سے پتہ چلا کہ اجماع صرف قول معصوم کی بناء پر حجت ہوا ورنہ صرف اتفاق کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی بناء پر سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے فرمایا ہے: "اذا کان علة کون الاجماع حجة کون الامام فیھم نکل جماعة کثرت او قلت کان قول الامام فی اقوالھا باجماعھا حجة وان خلاف واحد

او اثنین اذ کان احد هما قطعاً او تجویزاً یقتضی عدم الاعتبار بقول الباقین وان کثروا" خلاصہ یہ ہے کہ جب اجماع کے حجت ہونے کا سبب صرف امام کا ان کے ساتھ ہونا ہے، تو جس گروہ میں امام کا قول شامل ہو جائے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ اس کا قول حجت ہو جائے گا اور اگر تنہا امام یا دو ایسے آدمی جنھیں ایک کے امام ہونے کا امکان ہو مخالف ہوں تو باقی لوگوں کے قول کی طرف کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔ لیکن اس قسم کا اجماع کہ ایک گروہ کسی مسئلہ پر اتفاق کرے جن میں ایک یقیناً امام ہو، لیکن معین طور پر معلوم نہ ہو کہ ان میں سے کون امام ہے (کیونکہ اگر معلوم ہو گیا تو پھر دوسروں کے قول تو ناقابل توجہ ہوں گے صرف امام کے قول پر نظر کی جائے گی) زمانہ حضور امام میں تو ہوا نہیں، اور زمانہ غیبت میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، لہذا یہ صرف ایک فرضی مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔

ہاں دو طرح غیبت امام علیہ السلام میں بھی اجماع کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ پہلے قاعدۂ لطف کی بنا پر۔ اور دوسرے۔ اجماع کشفی۔

۱۔ قاعدہ لطف :- جناب شیخ طوسی اور بعض دیگر علما نے یہ فرمایا ہے کہ :- اگر تمام امت کسی ایسے مسئلہ پر اتفاق کر لیتی جو خلاف واقع ہوتا، اور قول حق ان کے درمیان موجود نہ ہوتا، تو حق تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ رہ جاتا، چونکہ خداوند عالم نے اپنے لطف و رحمت کی بنا پر کبھی حق کا دروازہ متلاشی حق کے لیے مسدود نہیں ہونے دیا اسی لیے شریعتیں آئیں، انبیا بھیجے گئے کہ طالبان حق، حق تک پہنچ سکیں، لہذا جب تمام امت کسی قول باطل پر اتفاق کر لے تو امام کے لیے جو راہنمائے حق اور حجت خدا ہے لطفاً لازم ہو جاتا ہے کہ حکم حق پہنچا دے، تو تمام امت کا کسی حکم پر متفق ہو جانا اور کسی اختلافی آواز کا نہ پایا جانا دلیل ہے کہ یہ حکم امام علیہ السلام کے نزدیک مخالف حق نہیں۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے اس دلیل کو یہ کہہ کر رد فرمایا ہے :- ممکن ہے تمام امت باطل پر مجتمع ہو جائے

اور امام علیہ السلام حق کو ظاہر نہ فرمائیں کیونکہ ان کی غیبت اور ان کے فیوض سے محرومی کا سبب خود امت ہی ہوئی ہے، لہذا جب خود کوئی الطاف الہٰی سے محرومی کا سبب بنے تو لطف اللہ پر لازم نہیں رہتا ہے۔

اجماع کشفی :- کبھی ایسا ہوتا ہے کسی قوم یا گروہ کا اتفاق اس کے راس و رئیس کی رائے سے کاشف ہوتا ہے۔ مثلاً تمام اصحاب آئمہ کسی بات پر متفق ہوں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام کا حکم اسی کے موافق ہے ورنہ سب لوگ ایک بات پر مجتمع نہ ہوتے مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان لوگوں نے کسی اجتہادی دلیل پر اعتماد کرتے ہوئے اتفاق نہ کیا ہو بہر صورت اس اجماع کا تصور بھی زمانہ حضور (امام یا حضور) سے قریبی دور میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

زیادہ تر اجماع کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے اس سے مراد شہرت فتوائی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ شہرت سے صرف ظن حاصل ہو سکتا ہے۔

دلیل عقلی :- احکام شرعیہ میں دلیل عقلی سے مراد ہے، وہ حکم عقلی جس سے کوئی حکم شرعی حاصل کیا جائے اور حکم عقلی سے حکم شرعی کی طرف منتقل ہوا جائے۔

حکم عقلی سے حکم شرعی حاصل ہونے کی چند صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کسی شئی کے متعلق عقل یہ فیصلہ کرے کہ خالق حکیم و علیم و عادل جو ہر اچھائی کو دوست رکھتا ہے اور ہر برائی کو ناپسند کرتا ہے یقیناً میرے اس عمل کو پسند یا ناپسند کرے گا۔ اور اگر میں اس کو انجام دوں گا تو اس پر جزا یا سزا دے گا۔ مثلاً عقل خود یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ عدل و احسان کو پسند فرمائے گا۔ اور ظلم کو یقیناً ناپسند کرے گا۔ اور پہلی صورت میں جزا اور دوسری صورت میں مجھے سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے اس حکم عقلی کی بنا پر حکم شرعی حاصل ہو گیا، اور اس قسم کے عقلی احکام کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حکم شرعی کے مناط اور علت کو صرف استحسان عقلی کی

بنا پر معین کیا جائے۔ بمثلاً صبح کی نماز کے دو رکعت ہونے کی وجہ سوائے اس کے اور
کوئی نہیں ہو سکتی ہے کہ اس وقت نیند کا غلبہ ہوتا ہے نماز کا وقت تنگ ہوتا ہے لہذا
جلد از جلد دو رکعت نماز پڑھ کر سو رہے۔ اس قسم کے استحسانات پر اعتماد کرنا اور احکام
شرعیہ کی اپنی عقل سے توجیہیں کرنا اور ان پر بھروسہ کر کے دوسرے احکام کو ان پر
منطبق کرنا یہ یقیناً درست نہیں ہے یہی قیاس ممنوع ہے اور اس قسم کے عقلی گدوں کے لیے
احادیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ "ان دین اللہ لا
یصاب بالعقول"۔ "یا ولا شیٔ ابعد عن دین اللہ من العقول"۔ اس لیے کہ
کبھی کسی کام میں عقل کسی مصلحت کا ادراک کرتی ہے، مگر اس میں کوئی مفسدہ بھی ہوتا ہے
جس تک عقل نہیں پہنچ پاتی ہو یا جس مصلحت کا عقل نے ادراک کیا ہے اس کے وجود میں آنے
سے کوئی مانع ہوتا ہے، یا کوئی شرط ہوتی ہے جو مفقود ہوتی ہے .... عقل کے لیے
یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام اطراف و جوانب پر اس طرح مکمل احاطہ کر لے کہ دوسرا کوئی امکان تصور ہی نہ کیا جا سکے
لہذا صرف عقل پر بھروسہ کر کے کسی حکم شرعی کی علت کو معین کرنا اور اس استنباطی علت کی بنا پر جہاں
یہ پائی جاتی ہے حکم شرعی جاری کر دینا درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عقل کا ضمنی حکم: بعض اوقات کسی حکم شرعی کی وجہ سے عقل کسی دوسرے حکم کا پتہ بتاتی ہے، مثلاً جب
شرع نے کوئی چیز واجب کر دی (ذی المقدمہ) تو عقل سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ باتیں جن پر اس شئی کا وجود موقوف
ہو (مقدمہ) خود بخود واجب ہو جائینگی مثلاً نماز واجب ہوئی تو عقلاً خود بخود وضو واجب ہو گیا، جب وضو واجب
ہوا تو پانی کی تحصیل خود بخود واجب ہو گئی، کنوئیں پر جانا، کنوئیں میں ڈول ڈالنا اور پانی نکالنا
ان سب کے وجوب کو عقل نے بتا دیا ہے ان کے لیے حکم شرعی ہو یا نہ ہو یا جب نماز
کا وقت تنگ ہو جائے، تو وہ امور جو نماز سے باز رکھنے والے ہوں خود بخود حرام
ہو جائیں گے۔ پہلی صورت جس میں حکم شرعی براہ راست عقل سے حاصل ہو رہا ہو،
اس کو مستقلات عقلیہ کہا جاتا ہے، اور دوسری صورت جہاں حکم شرعی کے ضمن میں حکم عقلی

حاصل ہو جائے، حکم عقلی غیر مستقل کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ حکم اگرچہ عقل نے حاصل کیا ہے، مگر حکم شرعی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے، اگر نماز واجب نہ ہوتی تو وضو واجب نہ ہوا ہوتا، اگر وضو واجب نہ ہوتا تو پانی حاصل کرنا واجب نہ ہوتا۔

قیاس :۔ علماء اسلام میں کچھ قیاس کو بھی، کتاب، سنت اور اجماع کی طرح شرعی دلیل قرار دیتے ہیں اور بعض علماء خصوصاً شیعہ اس کو دلیل تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ قیاس سے مراد وہی ہے جس کو ہم دلیل عقلی کی دوسری قسم میں بیان کر چکے ہیں، یعنی کسی حکم شرعی کی علت کو عقل کے ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اس علت مظنونہ کی بنا پر اس حکم کو دوسری جگہ بھی جاری کرنا۔

قیاس میں چار رکن ہوتے ہیں :۔ (۱) اصل :۔ جس شئی کا حکم شرعی معلوم ہو، اور اس پر دوسری شئی کے حکم کا قیاس کیا جا رہا ہو، مثلاً ہم کہیں کہ شراب اسی لیے حرام ہے کہ اس میں سکر (مدہوشی ہوتی ہے) اور چونکہ نبیذ میں بھی سکر ہے، لہٰذا وہ بھی حرام ہے۔ اس مثال میں اصل شراب قرار پائے گی، کیوں کہ اسی کے حکم پر قیاس کیا گیا ہے۔

(۲) فرع :۔ وہ شئی جس کا حکم معلوم نہ ہو اور معلوم الحکم پر قیاس کرکے حکم لگایا جائے مذکورہ بالا مثال میں نبیذ۔

(۳) علت :۔ اس سے مراد وہ سبب ہے جو فرع اور اصل دونوں میں مشترک ہو، اور جس کی بنا پر اصل کا حکم فرع پر جاری کیا جائے، جو مذکورہ مثال میں سکر ہے۔

(۴) حکم :۔ اس سے مراد ہے کہ شارع نے اصل کے لیے اپنے احکام میں جس قسم کا حکم قرار دیا تھا، اسی قسم کا حکم فرع میں بھی جاری کرنا جو مثال میں حرمت ہے۔

بعض اہلسنت، اور تمام شیعہ قیاس کو تسلیم نہیں کرتے، آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے قیاس کی مخالفت میں متواتر احادیث وارد ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا: کسی مومن کا قتل زیادہ بڑا گناہ ہے یا زنا۔

امام ابو حنیفہ نے کہا قتل نفس زیادہ عظیم ہے۔ امام نے فرمایا تو کیا بات ہے کہ زنا کے
ثبوت کے لیے چار گواہ ضروری ہیں اور قتل نفس کے لیے صرف دو گواہ کافی ہیں۔
پھر امام جعفر صادقؑ نے سوال کیا: نماز زیادہ اہم ہے یا روزہ امام ابو حنیفہ نے
کہا نماز، امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: تو پھر حائضہ پر نماز کی قضا کیوں نہیں، اور روزے
کیا قضا کیوں واجب ہے: "فکیف ویحک یقوم لک قیاسک! اتق اللہ ولا
تقس الدین برایک" — افسوس تمہارے حال پر، جب یہ صورت ہے تو
قیاس کیونکر درست ہو سکتا ہے، اللہ سے ڈرو اور دین کے معاملہ میں اپنے
قیاس کو دخل نہ دو۔

منصوص العلت: جس قیاس کو شیعہ نہیں مانتے اس سے مراد وہ قیاس ہے
جس میں حکم کی علت شریعت نے نہ بیان کی ہو، اور انسان اپنی عقل سے اس کو
دریافت کرے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ خود شریعت نے بیان کر دیا ہو کہ حکم
کیوں دیا جا رہا ہے اعلی الخصوص اگر یہ پتہ چل جائے کہ حکم کی بنیاد بس وہی علت
ہے جو بیان کی گئی ہے، محکوم علیہ کی ذات کو حکم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً
شراب ہی کے متعلق شریعت میں یہ ارشاد ہے " الخمر حرام لانہ مسکر" شراب
حرام ہے کیونکہ وہ مسکر ہے، حرمت کی اصل بنیاد بس مسکر ہونا ہے، اسی لیے جب شراب
سرکہ بن جاتی ہے تو حرام نہیں رہتی۔ تو اب جو چیز بھی مسکر ہو وہ حرام ہو جائے
گی، اس کو قیاس نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ حکم کا تعلق خمر سے نہیں سکر سے، خمر تو اس
لیے حرام تھی کہ وہ بھی مسکرات میں کی ایک فرد تھی، لہذا دوسری فرد بھی جو مسکر ہے
حرام قرار پائے گی۔

قیاس اولویت: اس کو مفہوم موافق، اور فحوی خطاب بھی کہتے ہیں۔ اس کی مثال
یہ ہے کہ جب شریعت میں یہ نص ملی، " اذا بلغ الماء قدر کر لم ینجسہ شئ" جب پانی

کر بھر ہو تو وہ نجاست پڑنے سے نجس نہیں ہوتا، تو بالاولویت اگر دو تین کر ہو تب بھی یقیناً نجس نہیں ہوگا یا جب آیہ کریمہ میں ارشاد ملا۔ لا تقل لھما اف۔ ماں باپ کے مقابلہ میں اف بھی نہ کہو، تو یقیناً بدرجہ اولیٰ ان کو سخت سست کہنا حرام ہوگا۔ اس قیاس بالاولویت کو وہ لوگ بھی جو قیاس کے منکر ہیں تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیاس نہیں یہ مطلب تو ضمناً خود لفظ سے نکل آتا ہے، اور اس مفہوم کو ہماری عقل خود نص سے حاصل کر لیتی ہے۔

استحسان :- قیاس کی طرح استحسان کو بھی بعض علماء اسلام حجت قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد کو جو بات پسند آئے، بہتر معلوم ہو، اور شریعت کے عام مزاج سے مرتبط معلوم ہو۔ اس کے مطابق حکم کیا جائے۔

یہ بھی شیعوں کے نزدیک حجت نہیں ہے اور تمام وہ حدیثیں جو قیاس کے ابطال کے لیے ہیں ان سب سے استحسان بھی باطل ہو جاتا ہے، بلکہ یہ تو قیاس سے بھی کمتر چیز ہے کم از کم قیاس میں حکم کی بنیاد تو موجود تھی جس پر قیاس کیا گیا تھا، اور استحسان میں تو سوائے مجتہد کی رجحان طبع کے کوئی بنیاد ہی نہیں، ایک چیز جو مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے کو بھی اچھی معلوم ہو۔ حالات ماحول اور اختلاف مزاج کے لحاظ سے پسند و ناپسند بدلتی رہتی ہے۔ خالی کسی شخص کی ذاتی پسند کو چاہے اس کی شخصیت کتنی ہی بلند ہو شریعت کے احکام کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اسلامی شخصیتیں اور واقعات

اسلام کی شخصیتوں اور واقعات خاص طور پر جو نزاعی ہوں۔ ان سے بحث کرنے میں زیادہ مہارت فن اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقیدت میں غلو یا مخالفت کی شدت کی بنا پر حقائق پر پردہ ڈالنے کی جانی بوجھی کوششیں کی گئی ہیں۔ حکومتوں نے لالچ اور

دباؤ کے تمام اختیار استعمال کر کے تاریخ کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرنے کی سعی پیہم کی ہے۔

احادیث رسول کے متعلق یہ مسلم حدیث موجود ہے کہ رسول نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا اس نے اپنی جگہ جہنم میں بنالی، جب جھوٹی حدیثیں گڑھ لینے میں بڑے بڑے بظاہر مقدسین نے جھجک محسوس نہ کی تو واقعات و حالات میں کتر بیونت کرنے اور غلط سلط واقعات بیان کر دینے سے کیا چیز روک سکتی تھی۔ وضع احادیث کے بڑے دلچسپ واقعات تاریخ میں ملتے ہیں، ایک صاحب نے صرف اس لیے کہ بادشاہ وقت کو کبوتر بازی کا شوق تھا، رسول کی ایک حدیث جس میں ارشاد تھا کہ گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی میں شرط لگائی جا سکتی ہے، بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے کبوتر بازی کا بھی اضافہ کر دیا۔ جب بظاہر ثقہ لوگ احادیث میں اتنی بددیانتی کر سکتے ہوں، تو پھر ان کے بیان کردہ واقعات پر آنکھ بند کر کے کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے، راویوں کے ظاہری تقدس و دیانت کو دیکھ کر بعض اسے مورخ بھی دھوکا کھا گئے ہیں، جو معتبر واقعات درج کرنا چاہتے تھے۔

لہٰذا جو باتیں عام شخصیتوں اور واقعات پر تحقیق کے سلسلہ میں تحریر کی گئی ہیں، ان کا اس موضوع پر لکھنے میں زیادہ لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اور زیادہ جستجو زیادہ مہارت فن، زیادہ ہوشیاری سے کام کرنا لازم ہے۔

دوسرا باب

مقدمات تحقیق

سپروائزر۔ (نگراں استاد) اس کی مثال اس بوڑھے پہلوان کی سی ہے جو اکھاڑے کے کنارے بیٹھا شاگردوں کو داؤں پیچ بتاتا رہتا ہے۔ سپروائزر کی مہارت فن، ہمدردی اور طالب علم کو مناسب وقت دے سکنے کا تھیسس کی کامیابی میں بہت دخل ہے۔ کسی استاد کی صرف شہرت کافی نہیں بلکہ اس کو ریسرچ کے موضوع پر بھی پورا عبور ہونا چاہیے کیوں کہ مصادر کا نشان بہت کچھ سپروائزر ہی سے ملتا ہے اس کے پاس اتنا وقت بھی ہو کہ طالب علم کی مدد کر سکے، اپنے ہی مشاغل میں اتنا مصروف نہ ہو کہ ریسرچ اسکالر کو مدد دینے کے لیے وقت نہ بچا پائے۔ ایسے مشغول ماہرین فن کی مثال اس پانی کی سی ہے جو کنوئیں کی تہ میں لہریں لے رہا ہو اور جگت پر پیاسا، حسرت سے دیکھتا رہے۔

ریسرچ اسکالر کو اپنے انداز سے سپروائزر پر یہ اثر بٹھا دینا چاہیے کہ وا قعتاً دل و جان سے مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے، اس کا مقصد تحقیق ہے صرف ڈگری حاصل کرنا نہیں۔ اس طرح سپروائزر کی پوری ہمدردی حاصل ہو جائے گی اور یہ حسن ظن (سند حاصل ہونے تک) تھیسس کی ہر منزل میں معاون ہوگا۔

انتخاب موضوع میں بھی سپروائزر کی اعانت اور اس کی رائے، بہت دخل رکھتی ہے، کیونکہ وہ اپنی وسیع اطلاعات کی بنا پر یہ بتا سکتا ہے کہ موضوع پر جس طرح طالب علم کام کرنا چاہتا ہے، اس انداز پر کام ہو چکا ہے، یا کہیں کام ہو رہا ہے، اب اس کی کوشش تحصیل حاصل قرار پائے گی۔ یا موضوع ایسا خشک اور بے فائدہ ہے، کہ تحقیق میں جو وقت صرف ہوگا وہ رائیگاں جائے گا۔ یا مواد ریسرچ اسکالر کی دسترس سے باہر ہے۔

موضوع معین ہونے اور کام شروع کرنے کے بعد طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ اپنا رابطہ سپروائزر سے قائم رکھے اور اس کو یہ بتاتا رہے کہ کتنا کام کیا ہے، اور تحقیق کن مراحل سے گذر رہی ہے، اس سے خود طالب علم سپروائزر کے تجربے سے برابر

استفادہ کرتا رہے گا۔ اور اگر کوئی غلط قدم اٹھا رہا ہے، تو منزل سے دور نکلنے سے پہلے ہی سپروائزر اس کو متنبہ کر دے گا، اور نگراں اُستاد کو یہ فائدہ ہوگا کہ رپورٹ دیتے وقت اُسے زیادہ محنت نہ کرنا پڑے گی کیونکہ تھیسس کے جزئیات سے باخبر ہونے کی بنا دہ پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکا ہوگا۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تھیسس کی ذمہ داری سپروائزر پر کسی طرح نہیں آتی ہے، اسکی مکمل جوابدہی ریسرچ اسکالر پر ہے۔ کیونکہ سپروائزر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنی معلومات اور تجربے کے لحاظ سے تھیسس لکھوا دے، اس کا کام صرف مشورہ دینا اور تھوڑی بہت اصلاح کر دینا ہے۔ تاکہ خود شاگرد میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ سپروائزر کی عدالت کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اسکی زیر نگرانی جو تھیسس لکھی جا رہی ہو، اس کو اپنے انداز تحقیق کا آئینہ دار، اور اپنے رنگ میں رنگا ہوا بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ ہر تھیسس کو اس کو لکھنے والے کے انداز اور صلاحیتوں کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ خود طالب علم کا جوہر کھل کر سامنے آسکے۔

انتخاب موضوع:۔ موضوع کا انتخاب تھیسس کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے، یہ ینو کی وہ خشت اول ہے کہ اگر کج ہو گئی، تو ثریا تک دیوار کج ہی رہے گی۔ بعض اوقات پی ایچ ڈی، کے شوق میں طالب علم اس پر زیادہ غور نہیں کرتے اور بعد میں ان کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم کو جس موضوع سے دلچسپی ہوتی ہے، اور جس کا مواد اس کو آسانی سے مل سکتا ہے اس پر تھیسس لکھی جا چکی ہے، یا کسی دوسرے نے کام شروع کر دیا ہے یہ دیکھ کر وہ مایوس ہو جاتا ہے حالانکہ اگر غور کرتا تو اس کو پتہ چل جاتا کہ اس موضوع میں ایسے گوشے موجود ہیں جو اچھوتے ہیں۔ اور جن پر تحقیق سے عظیم فوائد حاصل ہو سکتے۔ لہذا موضوع اختیار کرنے سے پہلے خود بھی غور و خوض کرنا چاہیئے، اپنے اساتذہ اور دیگر ماہرین فن سے بھی پورا پورا فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ جب غور و فکر اور مشورے کے بعد کوئی موضوع قابل بحث معلوم

ہوں، تو ان کو حسبِ ذیل سوالوں کے پیشِ نظر جانچا جائے، جس موضوع کے متعلق ہر سوال کا جواب اثبات میں ہو اس کو اختیار کیا جائے اور اگر ایک کا جواب بھی نفی میں ہو تو اس کو رد کر دیا جائے۔ کئی موضوعوں کے متعلق سب جواب اثبات میں ہوں تو دیکھا جائے کہ ان میں سے کس موضوع کے متعلق سب یا بیشتر سوالات کو ترجیح حاصل ہے۔

۱۔ آیا موضوع پر تحقیق سے حاصل شدہ نتائج اتنی اہمیت رکھیں گے کہ اس پر صرف ہونے والے وقت اور کوشش کی قیمت قرار پا سکیں۔

۲۔ کیا موضوع میں اتنی گنجائش ہے کہ مستقل تھیسس لکھی جا سکے۔

۳۔ کیا اس پر کام بس میں ہے۔

۴۔ کیا موضوع سے طالب علم کو دلچسپی ہے، اور اس کے مزاج سے ربط رکھتا ہے۔

سوالوں کی توضیح :- ۱۔ ہر موضوع اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر بحث و تحقیق میں اپنا وقت اور صلاحیتیں صرف کی جائیں، ریسرچ کا مقصد کسی بھی موضوع پر تھیسس لکھ کر ڈگری حاصل کر لینا نہ ہونا چاہیے، بلکہ کسی ایسے زندہ موضوع کو منتخب کرنا چاہیے، جو اہلِ علم کے لیے محلِ فکر و نظر ہو دنیائے علم میں کچھ اضافہ ہو کوئی گتھی سلجھے اور کوئی الجھن دور ہو۔

اپنی محنتوں سے آئندہ یہ خود اور اس کی نشر و اشاعت سے دوسرے فائدہ اٹھا سکیں، تھیسس الماری کی زینت نہ بنے بلکہ مطالعہ کی میز پر رہا کرے۔

بہتر ہے کہ ایسا موضوع منتخب کرے جو اس کی آئندہ عالمی زندگی سے مربوط ہو اور جس سے آیندہ تعلق باقی رہنے والا ہو۔

۲:- کبھی موضوع تو مفید اور نیا ہوتا ہے، لیکن اتنا مواد موجود نہیں ہوتا کہ اس پر

تھیس لکھی جائے، علمی رسالے کے لیے مقالہ لکھنا اور ہے اور تھیس دوسری چیز ہے، علمی مقالے اور تھیس میں یہی فرق ہے، اس کے لیے چند صفحے کافی ہوتے ہیں جبکہ تھیس میں اتنا پھیلاؤ ہونا چاہیے کہ اس کو کتاب کہا جا سکے، کبھی مواد کی کمی کی بنا پر مضامین کی تکرار غیر متعلق باتوں یا بھرتی کی چیزوں سے کتاب کے حجم کو بڑھانا پڑتا ہے یہی چیزیں تھیس کے لیے عیب بن جاتی ہیں اور تھیس رد کر دی جاتی ہے۔

۳- کبھی موضوع بھی نیا ہوتا ہے۔ مواد بھی کافی ہوتا ہے، لیکن اس تک رسائی طالب علم کے امکان میں نہیں ہوتی۔ مثلاً موضوع کے متعلق معلومات ایسی زبانوں میں ہیں جن سے طالب علم خود واقفیت نہیں رکھتا دوسروں سے ترجمہ کرانے میں اولاً تو ہر ہر قدم پر دوسروں کا محتاج رہنا پڑے گا پھر ترجمے پر پورا بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مطلب صحیح ادا ہوا یا نہیں اگر یہ بھروسہ ہو بھی جائے، تو ہر زبان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو ترجمہ میں آ ہی نہیں سکتیں لہذا وہ فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جو اس زبان پر حاوی ہونے اور مہارت سے ہوتا۔ کسی موضوع پر لکھنے کے لیے اپنے مالی امکانات بھی زیر نظر ہونا چاہیے کیوں کہ بعض اوقات موضوع سے متعلق مواد ایسے دور دراز مقامات سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں کے سفر کے اخراجات اور قیام کے مصارف اگر امکان میں نہ ہوں تو اصل ماخذ تک پہنچنے اور انھیں حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے اور تحقیق کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ موضوع اتنا پھیلا ہوا نہ ہو کہ معلومات کے جمع کرنے ان کی ترتیب و تدوین اور نتائج حاصل کرنے کے لیے جتنا وقت درکار ہے اس کی گنجائش اس میں نہ ہو جتنا وقت تحقیق کے لیے اس کو دیا گیا ہے۔ بعض موضوع ایسے ہو سکتے ہیں جن پر کام کرنا کسی طالب علم کے لیے بہ نسبت دوسرے طالب علموں کے زیادہ آسان ہو، مثلاً اس کے ذاتی یا خاندانی کتب خانے میں موضوع سے متعلق کافی مواد

موجود ہو، یا اس کی دسترس میں ایسے اہم مخطوطے ہوں جن سے موضوع کو حل کرنے میں آسانی ہو۔ ایسی صورت میں یہی موضوع دوسرے موضوعوں کے مقابلے میں مناسب تر قرار پائے گا۔

۴۔ بعض موضوعوں سے کچھ لوگوں کو فطری تعلق اور خصوصی میلان ہوتا ہے، کسی کو ادب کا ذوق ہوتا ہے، کوئی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے اور کسی کا لگاؤ سائنس کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اگر اپنے میلان اور طبیعت کے مطابق موضوع منتخب کرے گا تو اس کی دلچسپی آخر تک قائم رہے گی۔ جذبات و میلانات سے تھوڑے دن لڑا جا سکتا ہے، لیکن تھیسس کے موضوع سے تو اس کو برسوں رابطہ رکھنا ہے، لہٰذا وہ ایسا ہونا چاہیے جس میں پوری طرح ڈوب سکے، جو اس کی رگ و پے میں سرایت کر سکے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذوق و شوق بھی بڑھتا ہی جائے طبیعت بھاگنے نہ لگے۔

ریسرچ کے لیے کبھی ایسا موضوع نہ منتخب کرنا چاہیے جس کے موافق یا مخالف رائے پہلے سے ذہن میں جم چکی اور اپنے عقیدے کی پختگی کی بنا پر اس کے مخالف سوچنا مشکل ہو، یا ماحول ایسا ہو جس میں اپنی دیانتدارانہ رائے کو صحیح طریقے پر پیش نہ کر سکے۔ مثلاً کسی متعصب کمیونسٹ سے یہ امید فضول ہے کہ وہ سرمایہ دار ملکوں کے اقتصادی نظام پر بے لاگ تبصرہ کر سکے گا، یا کسی متعصب عیسائی کے لیے یہ مشکل ہے کہ صلاح الدین ایوبی پر پوری دیانتداری سے کام کر سکے۔ جس طرح اپنے عقیدے کے خلاف عادلانہ رائے قائم کرنا دشوار ہے، اسی طرح ایسے موضوع سے بھی انصاف ممکن نہیں، جس کی موافقت میں پہلے سے خیالات موجود ہوں، اور جس کے خلاف سوچنے کی بھی جذبات اجازت دیتے نہ ہوں۔ جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ پر تحقیق کا کام کرے تو تعریف کے پل تو باندھ سکتا ہے لیکن یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اس کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو بھی ہدف الزام کر سکے گا۔ مان لیا جائے کہ کسی موضوع سے قریبی تعلق رکھنے والا پوری

دیانت داری سے اپنی رائے پیش کرے گا اور اپنی عقل کو جذبات سے بالکل بے تعلق کرلے گا۔ پھر بھی دوسروں پر یہ تاثر ہونا اس کی رائے غیر جانبدارانہ ہے، مشکل ہے، لہذا تھیسس سے پورا فائدہ حاصل نہ ہوگا، اس کے مخالف ریمارک سند میں پیش کئے جاسکیں گے، لیکن تائیدی رائے کو جانبداری پر محمول کردینا آسان ہوگا۔

کسی موضوع پر کتاب لکھنے اور ریسرچ کرنے میں فرق ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کتاب کا بنیادی مقصد صرف کسی شخصیت کے فضائل کو ظاہر کرنا، اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کو دور کرنا ہی ہو، اس ضمن میں بہت سی مفید اور اچھی باتیں بھی آسکتی ہیں اور کچھ مسئلوں کی تحقیق و تنقیح بھی ہوسکتی ہے، لیکن اس طرح کے مخصوص مقاصد کے پیش نظر جو کام کیا جائے، اس سے ایک اچھی کتاب تو مرتب ہوسکتی ہے لیکن اسکو تھیسس نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ ریسرچ اسکالر کا کام کسی بات کا فیصلہ کرکے اس کے موافق یا مخالف تائیدی اسناد حاصل کرنا نہیں ہے، وہ رسالے کو اپنے معینہ افکار کا آئینہ نہیں بناتا بلکہ خود مواد کے پیچھے چلتا ہے۔، حاصل شدہ معلومات کو اس کو جدھر جدھر موڑتی ہیں مڑتا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چاروں باتیں طالب علم کی نظر میں کسی موضوع کے انتخاب کی دعوت دے رہی ہوں تب بھی صرف اپنی رائے پر اکتفا نہ کرے، کیونکہ جیسا بتایا جاچکا ہے، انتخاب موضوع سب سے اہم اور بنیادی قدم ہے اس کو ہر طرح مکمل اور درست ہونا چاہیئے۔

گریجویشن یا پوسٹ گریجویشن میں، جن فنون پر کام کرچکا ہے تھیسس بھی انھیں میں سے کسی ایک کے متعلق یا انھیں میں سے کسی ایک سے مربوط ہونا چاہیئے۔

جس فن سے متعلق ریسرچ کرنا چاہتا ہو اس کے مختلف موضوعات پر درجنوں ریسرچ

کرنا مناسب معلوم ہو، مختصر مقالات لکھ کر سپروائزر کو دکھا لے تاکہ وہ اندازہ لگائے
کہ کس موضوع پر بہتر طریقے پر کام کر سکے گا وہ طالب علم جو پی ایچ۔ڈی سے آگے قدم
بڑھا کر ڈی۔ لٹ بھی کرنا چاہتے ہوں ان کو چاہیے کہ تھیسس کے لیے ایسا موضوع منتخب
کریں جن میں کچھ گوشے موجود ہوں جو تھیسس سے قریبی تعلق رکھتے ہوں اور انہیں ڈاکٹریٹ
کے قابل زیادہ ٹھوس اور تحقیقاتی کام کیا جا سکے، اس صورت میں پی ایچ۔ڈی کے لیے
کی ہوئی محنت اور جمع شدہ مواد ڈی لٹ کے لیے بھی بہت معاون ہوگا اور اچھی خاصی
محنت بچ جائے گی۔ جن کی نظر اور زیادہ بلند ہو اور صرف ڈاکٹریٹ ہی کو اپنے لیے
معراجِ کمال نہ سمجھتے ہوں وہ ڈی لٹ کے لیے بھی ایسا موضوع منتخب کریں جس میں آئندہ
بھی تحقیق و تنقیح کی راہیں کھلی ہوں اور تعلیمی زندگی کے بعد بھی تحقیق کا کام جاری
رکھ سکیں۔

تھیسس کسی ایک طالب علم کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن ہو سکتا ہے
کہ کسی ایک ہی موضوع کے مختلف گوشے ہوں اور ان میں سے ہر گوشے پر علیحدہ علیحدہ
مختلف طالب علم مستقل کام کریں اس طرح اگرچہ ان طلبا کی اجتماعی کوششیں موضوع کے
مختلف پہلوؤں کو روشن کریں گی لیکن ہر طالب علم کا کام اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا
ہوگا۔ مثلاً کوئی طالب علم مغل دور کے سیاسی حالات کوئی ان کے مالی نظام اور کوئی
اس دور کے ادبیات پر ریسرچ کرے، ان سے ہر طالب علم کا کام اپنی جگہ مستقل حیثیت
رکھتا ہوگا لیکن ان سب کتابوں کے مطالعہ سے مغل دور کی پوری تصویر سامنے آجائے
گی۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ کسی ایک ہی موضوع کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور پر
الگ الگ طالب علم تحقیق کریں۔

موضوع کی تبدیلی:۔ بعض اوقات پورے غور و خوض کے بعد ایک موضوع اختیار
کر لیا جاتا ہے، لیکن جب کام شروع کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انتخاب موضوع میں

غلطی ہوئی تھی، مثلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم جس انداز سے تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اس پر کوئی دوسرا پہلے کام کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔ یا مواد اتنا نہیں کہ تھیسس مرتب کی جا سکے۔ یا اصلی مآخذ دسترس سے باہر ہیں۔ یا طبیعت پوری طرح نہیں لگ رہی ہے۔ غرض جیسے ہی طالب علم کو احساس ہو کہ وہ موضوع پر تحقیق کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ تو بغیر کسی تردد کے موضوع کو تبدیل کر دے اور اتنے دن کی محنت ضائع ہونے کے خیال سے آگے وقت برباد نہ ہونے دے کیوں کہ اولاً تو اس نے جو اب تک محنت کی ہے وہ حقیقت میں ضائع نہ ہوئی اصل مقصد علم اور صلاحیت میں اضافہ ہے، وہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معلومات کا حاصل شدہ ذخیرہ کسی دوسری تحقیق کے موقع پر اس کے لیے مفید ثابت ہو۔ اور یہ کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم آئندہ وقت بربادی سے بچ جائے گا، جس میں زیادہ بہتر اور مفید کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

ابواب و فصول

جس طرح ایک انجنیر مکان بنانے سے قبل اس کا نقشہ تیار کر لیتا ہے، اسی طرح کسی مسئلہ پر کام شروع کرنے سے پہلے اس کے متعلق عنادین، اور ضمنی عنادین معین کر لینا چاہیئے تاکہ بعد میں جو معلومات حاصل ہوتی جائیں وہ جس عنوان سے متعلق ہوں، اسی کے ضمن میں جمع کی جاتی رہیں۔

کوئی کلی قاعدہ اس کے لیے نہیں بیان کیا جا سکتا، کہ ابواب و فصول کیا کیا ہوں، کیونکہ جس طرح انجنیر جب نقشہ بناتا ہے تو اس کو دیکھنا ہوتا ہے، کہ کس عمارت کا نقشہ ہے، مکان بنانا ہے، مسجد یا مدرسے کی تعمیر مقصود ہے، جس ملک میں عمارت بن رہی ہے اس کے موسمی حالات کیا ہیں۔ جو شخص عمارت بنوا رہا ہے اس کے مادی امکانات کیا ہیں، نقشہ بناتے وقت ان باتوں اور ایسی ہی دیگر چیزوں

کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اور انھیں کے لحاظ سے ایک نقشہ دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تھیس کا خاکہ بناتے وقت موضوع کی وسعت اور تنگی، متعلقہ بنیادی مسائل، اور ضمنی سوالات، وہ فن جس کے متعلق موضوع ہے۔ اور وہ مدت جس میں تکمیل کرنا ہے۔ اسی طرح بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھ کر خاکہ مرتب کرنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ خاکہ مرتب کرنے میں دوسروں کے تجربات سے فائدہ حاصل کرلے، ہر یونیورسٹی کی لائبریری میں، مختلف موضوعوں سے متعلق اچھی تھیسس موجود ہوتی ہیں، ان میں سے ان کا انتخاب کرے، جو اس کے موضوع سے قریب ہوں، مثلاً اگر کسی شخصیت پر تحقیق کرنا ہے، تو ان لوگوں کی تھیس کا مطالعہ کرے جنھوں نے اشخاص پر تحقیق کا کام کیا ہیں اور دیکھیے کہ ان میں کس طرح ابواب وفصول قائم کیے گئے ہیں۔ اس طرح ریسرچ اسکالر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اپنے موضوع کے ابواب وفصول کس طرح مرتب کرے۔

عمومی طور پر صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تھیس کو حسب ذیل عنادین پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۱۔ تھیسس کا عنوان:۔ اس کو بہت ہی سوچ سمجھ کر معین کرنا چاہیے، یہ ایسا ہو کہ عنوان پر نظر پڑتے ہی دیکھنے والا یہ سمجھ لے کہ تھیسس کا تعلق کس فن سے ہے' اور اس فن کے کس جزء سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص اس موضوع کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس کو کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ صرف عنوان سے ہی اندازہ لگالے گا کہ اس کا مطالعہ مفید ہوگا یا نہیں۔

۲۔ موضوع کے ضمن میں جو بنیادی باتیں آتی ہوں، ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک عنوان مقرر کرلے، جس کو باب کہا جا سکتا ہے، اور ان بنیادی باتوں کے ضمن میں، ایسی جزئی باتیں جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہوں، ان کے لیے بھی ضمنی عنوان مقرر کرلے۔

جن کو فصل کہا جا سکتا ہے۔ ان تمام عنادین کو چاہیئے وہ ابواب سے متعلق ہوں یا فصول سے ایسا ہونا چاہیے کہ بیان کیے جانے والے مقصد کو پوری طرح واضح کر دیں۔

ابواب و فصول کی تقسیم پر پوری توجہ دی جائے، تاکہ کوئی خاص باب اور اس کے ضمن کی کوئی فصل رہ نہ جائے، ان کی ترتیب بھی کسی مناسبت بنیاد پر ہونا چاہیے مثلاً زمانہ کے لحاظ سے مقدم و مؤخر کیا جائے، یا اہمیت کے لحاظ سے ترتیب قائم کی جائے اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ رسالے کا عنوان کمزور یا مبہم نہ ہو، کیونکہ پہلی نظر عنوان ہی پر پڑتی ہے، اور پہلا تاثر قاری پر اسی سے قائم ہوتا ہے۔ جب ابواب و فصول کے عنوان مقرر ہو جائیں، تو انھیں کے مطابق فائل کو مرتب کر لیا جائے، اور اب موضوع کی تحقیق اور اس سے متعلقہ مصادر و مراجع کا مطالعہ شروع کیا جائے، (ابواب و فصول کی تنظیم کا طریقہ بعد میں ذکر کیا جائے گا) اب، جس باب کی جس فصل سے متعلق مواد ملتا جائے اس کو اسی کے ذیل میں صفحہ، سطر اور کتاب کے حوالے سے لکھتا جائے، آخر میں کچھ اوراق، مصادر اور حوالوں کی تفصیل کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے، جن میں جس کتاب سے حوالہ لیا گیا ہے اس کا نام، وہ مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، تاریخ طبع کیا ہے، مصنف کون ہے، اور کہاں دستیاب ہو سکتی ہے، اگر کوئی خاص کتاب ہے تو اس کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

اس کا خیال رہے کہ ضمن مطالعہ میں موضوع سے متعلق جو مواد بھی حاصل ہو چکا ہے وہ اس وقت غیر اہم ہی محسوس ہو رہا ہو، لیکن اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ کیونکہ ممکن ہو مطالعہ کے وقت جو بات غیر اہم معلوم ہوئی ہو، کتاب مرتب کرتے وقت اس کی ضرورت محسوس ہو، تو دوبارہ تلاش میں بہت وقت ضائع ہوگا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تلاش بسیار کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکے۔ لہٰذا یہ بہتر ہے کہ اگر ترتیب کے وقت ضرورت محسوس نہ ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے۔ مواد جمع کرتے وقت اگر کوئی خاص نکتہ ذہن میں آئے، تو اسکو

نوٹ کرتے جانا چاہیے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو بات ذہن میں ایک وقت آگئی ہے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھر اس بات کا خیال ہی نہیں آتا۔

مصادر کی تلاش: جب تحقیق شروع کرنا چاہے، تو مناسب ہے کہ اس موضوع سے مرتبط جو انسائیکلو پیڈیا نکل چکی ہوں ان میں اس کے متعلق جہاں جہاں بھی مواد ملنے کا امکان ہو وہاں تلاش کرلے، مثلاً اگر کسی اسلامی موضوع پر لکھنا ہے تو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، یا انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن، یا عرب سے متعلق انسائیکلو پیڈیا میں تلاش کرے، ایک ہی موضوع سے متعلق مواد مختلف عنادین اور ان اشخاص کے تذکروں کے ضمن میں مل سکتا ہے، جن کا اس موضوع سے کچھ تعلق رہا ہے۔ ان کتابوں میں طلبا و محققین کے فائدے کے لیے اصلی مصادر کا حوالہ بھی دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح ریسرچ اسکالر کو بغیر زحمت اٹھائے بہت سے اصلی مصادر کا پتہ چل جائے گا۔

(۲) وہ جدید کتابیں یا مقالات، جو موضوع یا اس سے مرتبط مسائل پر لکھے گئے ہوں، ان سے بھی اصلی مصادر کا پتہ چل جایا کرتا ہے۔ کیوں کہ ان میں اکثر حوالے درج کر دیے جاتے ہیں۔

(۳) ان اہل فن اور باخبر حضرات سے موضوع پر گفتگو کی جائے، جو اس میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ اس سے بہت سے مصادر کا پتہ چلنے کے علاوہ، دیگر کئی سود مند نئی باتوں کے معلوم ہونے کا قوی امکان ہے جن تک ریسرچ اسکالر کی نظر نہ پہونچی ہو۔

(۴) طالب علم کی جن لائبریوں تک پہونچ ہو سکے، ان کی لائبریرین اور ذمہ داروں سے قریبی تعلق قائم کرے۔ کیوں کہ ان کی نظر سے برابر کتابیں گذرتی رہتی ہیں، لہذا وہ موضوع کے متعلق رہنمائی کر سکتے ہیں۔

(۵) بڑے بڑے مطابع اور کتب خانوں کی فہرست پر ... نظر ڈالی جائے۔

خاص طور سے ان سیمیناروں کی فہرست کو ضرور دیکھ لیا جائے، جو موضوع سے متعلق ہوں، جیسے اسلامی موضوعات پر کام کرنے والے، فیکلٹی آف تھیالوجی، اسلامک اسٹڈیز، یا ویسٹ ایشین اسٹڈیز، یا قانون پر ریسرچ کرنے والے، شعبہ قانون سے متعلق سیمینار کی فہرست کا مطالعہ کریں، یقیناً ان میں ایسے مصادر مل جائیں گے جو موضوع سے قریبی تعلق رکھتے ہوں۔

(۶) طالب علم کو یہ بھی نصیحت کی جاتی ہے کہ مختلف علمی مجلات اور ڈائجسٹ جن تک پہونچ ہو سکے، ان کی فہرست مضامین پر بھی نظر ڈال لے ممکن ہے کہ کسی اچھے لکھنے والے کا کوئی ایسا مقالہ مل جائے جس سے موضوع کے سلسلے میں معلومات یا ایسے مصادر کا پتہ چل جائے جن کی طرف نظر نہ گئی ہو۔

کتب خانوں کے علاوہ مختلف اشخاص کے اور افراد کے پاس بھی موضوع سے متعلق کتابوں کے ملنے کا امکان ہے لہٰذا ایسے لوگوں سے بھی رابطہ قائم کرے، جن کے پاس قدیم کتب یا مخطوطات کے کچھ ذخائر ہوں، اگر ان کو موضوع سے مرتبط کتابیں عاریتاً مطالعہ پر دینے کے لیے راضی نہ کیا جا سکے، تو اہم کتابوں کی خریداری میں بھی کوتاہی نہ کرنا چاہیئے۔

اصلی مصادر:- جس موضوع سے بحث کرنا ہو اس کے قدیم ترین اور بنیادی مراجع جن میں مواد ملے اصلی مراجع و مصادر قرار پائیں گے۔ جتنا زیادہ اصلی مراجع سے مواد لیا جائے گا تھیسس اتنی ہی زیادہ قیمتی ہوگی۔ خصوصاً اگر ان مصادر میں کچھ ایسے ہوں جن سے پہلے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ تو ان کے حوالے سے تھیسس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی، اہم مصادر اصلیہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وہ قلمی کتابیں جو اب تک طبع نہ ہوئی ہوں۔ یا طبع ہو چکی ہوں تو کم یاب ہوں، اور ان میں ایسا مواد ملے جو مطبوعہ اور دستیاب کتب میں نہ پایا جاتا ہو۔

(۲) وثائق (وثیقہ کی جمع ہے) اس سے مراد وہ تحریریں ہیں جن سے کسی مسئلہ کا ثبوت بہم پہونچ جائے، جیسے وقف نامے اور وصیت نامے وغیرہ مثلاً کوئی شخص اس پر ریسرچ کر رہا ہو، کہ اودھ کی حکومت نے منظم مدارس قائم کیے تھے، جن میں مدرسین کو معین تنخواہیں اور طلبا کو وظیفے وغیرہ دیے جاتے تھے۔ اور اس کو اس سلسلہ میں کوئی شاہی فرمان یا وقف نامہ مل جائے، جس میں اس کا تذکرہ ہو کہ اتنا روپیہ مدرسین کی تنخواہوں یا وظائف پر صرف کیا جائے تو یہ فرمان یا وقف نامہ وثیقہ کہلائے گا۔ موضوع سے مربتط مقام پر اس کا حوالہ دینے کے بعد آخر کتاب میں بطور وثیقہ اس کو درج کر دیا جائے گا۔

(۳) وہ قضایا اور حکومتی فیصلے جن سے موضوع پر روشنی پڑتی ہو، روزنامچے جن میں ان مقامات، یا اشخاص کا ذکر ہو جو موضوع متعلق ہوں، تاریخی لوحیں، جو قبر وغیرہ پر پائی جاتی ہوں۔ ان میں وہ حکومتی اعلان بھی شامل ہیں، جو اعداد و شمار وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور وہ علمی تجربے بھی انھیں میں آجاتے ہیں جن کو اس فن سے متعلق معتبر علمی انجمنوں نے مان لیا ہو۔

(۴) مراجع ثانویہ میں اگر اصلی مصادر کا حوالہ نہ پایا جاتا ہو، جن سے مطالب کو لیا گیا ہے تو ان مراجع کا حوالہ ریسرچ اسکالر کے لیے زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ ہاں اگر ان کا مصنف اتنا معتبر و مستند سمجھا جاتا ہو کہ اس کا کسی بات کو ذکر دینا خود قابل اعتماد اور وزنی ہو۔ تو حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(۵) مراجع ثانویہ میں لکھنے والوں کے ذاتی افکار اور ان کے اخذ کردہ نتائج اگر ریسرچ اسکالر کی رائے کے موافق ہوں اور لکھنے والا بھی قابل اعتماد ہو تو ان کو بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۶) وہ امور جو مسلمات میں شامل ہوں اور قابل انکار نہ ہوں ان کے لیے کسی حوالے

کی ضرورت نہیں ہے۔

کتابیں اور اندازِ مطالعہ :- کتابوں کی مثال مصور کے برش کی سی ہے، یہ برش اگر کسی اناڑی کے ہاتھ میں ہو تو تصویر نہیں ابھرتی، اگر کسی ماہر کے ہاتھ میں ہو تو فطرت کا حسن جمال کھینچ آتا ہے۔ اس طرح کتابوں کو اگر کوئی نافہم پڑھتا ہے تو اس کے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ اور اگر سمجھدار مطالعہ کرتا ہے تو ذخیرۂ علوم اور اسلوب نگارش بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب تحقیق کے خطوط متعین ہو گئے اور مصادر مہیا ہو گئے تو ان کے مطالعے میں کیا دقت ہے، پڑھا جائے اور موضوع سے متعلق مناسب باتیں نقل کرتا جائے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ نفع بخش مطالعے کو سہل نہ سمجھنا چاہیئے، دوسروں کے خیالات کو ہضم کرنا، اور ان سے صحیح فائدہ اٹھانا کم لوگ جانتے ہیں۔ ایسا مطالعہ جس میں نقد انتقاد نہ ہو صرف پڑھ لیا جائے۔ سعی رائگاں ہے۔

ایک ریسرچ اسکالر سے امید کی جاتی ہے کہ موضوع کے متعلق اس کا مطالعہ وسیع ہوگا اور کوئی اہم کتاب نظر سے اوجھل نہ رہی ہوگی، ریسرچ کا وقت محدود ہوتا ہے، کثیر کتابیں محدود وقت میں کیوں کر پڑھی جائیں، اس کے لیے مطالعہ کے سلیقے کی بہت ضرورت ہے کہ کس کتاب کو کیوں کر پڑھا جائے، کچھ کتابوں کی اِدھر اُدھر سے ورق گردانی کافی ہوگی، کچھ کا سرسری مطالعہ کیا جائے گا، اور بہت کم کتابیں ایسی ہوں گی جن کو شروع سے آخر تک غور و توجہ سے پڑھا جائے، اور مصنف کے ہر ہر جملے پر توجہ کی جائے۔ جیسے دسترخوان پر کچھ کھانے چکھ کر چھوڑ دیے جاتے ہیں، کچھ پیٹ بھرنے کے لیے جلدی جلدی کھا لیتے ہیں۔ ہاں کچھ ایسے خوش ذائقہ ہوتے ہیں جن کا ہر نوالہ مزے لے کر کھایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی مہارت کی ضرورت ہے کہ تمام دستیاب مصادر سے محدود وقت میں کیونکر استفادہ کیا جائے؟

انداز مطالعہ:- بعض وہ باتیں بیان کی جاتی ہیں، جن کو ماہرین فن نے مطالعہ کے لیے لازم قرار دیا ہے۔

(۱) طالب علم کو اس بات میں مہارت حاصل ہو پرکھ سکے کون کتاب کس پائے کی ہے۔ اور ان میں سے کون مہم ہے اور کون اہم ہے، جیسی کتاب ہو ویسا ہی مطالعہ کا انداز بھی ہونا چاہیئے۔

(۲) تھکاوٹ اور ذہنی پریشانی میں مطالعہ نہ کرے، کیوں کہ اس حالت میں جو نتیجے اخذ کرے گا، وہ ذہنی انتشار کے آئینہ دار ہوں گے۔

(۳) عام طور پر صبح کے وقت ذہن زیادہ حاضر ہوتا ہے لہذا مطالعہ کے لیے یہ وقت بہتر ہے۔

(۴) وقت بچانے کے لیے صرف وہی مقامات دیکھے جو موضوع سے متعلق ہوں، جن کو فہرست مضامین دیکھ کر متعین کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ طریقہ قدیم کتابوں کے مطالعہ میں کام نہیں آئے گا، کیونکہ پرانے مصنفین ذرا ذرا سی مناسبت سے مختلف مطالب کو ضمن بحث میں درج کردیا کرتے تھے۔ لہذا پرانی کتابوں کا سرسری طور پر پورا مطالعہ کرنا ہوگا، اور جہاں موضوع سے متعلق بحث مل جائے اس پر خاص توجہ دینا ہوگی۔

اس ضمن میں ابن اثیر جزری صاحب تاریخ کامل کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اگرچہ انھوں نے واقعات سنہ وار لکھے ہیں، مگر ہر سنہ کے ضمن میں جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کی ایک فہرست بھی مرتب کردی ہے۔ اسی طرح بعض مستشرقین اور بعض عرب اساتذہ نے کچھ قدیم کتابوں کی فہرست مرتب کردی ہے، ان فہرستوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

بعض طالب علم اپنے مقام پر مطالعہ پسند کرتے ہیں اور بعض کتب خانوں میں یہ

اپنی اپنی سہولت اور آسانی پر موقوف ہے۔

اصلی ماخذ میں کسی ایک کتاب کا مطالعہ بھی ترک نہ کیا جائے، اور ضمن مطالعہ میں جب وہ مقام نظر آئے جو موضوع سے متعلق ہے تو مطالعہ بند کر کے اس کو اپنے رنگ فائل یا کارڈ پر (جو بھی طریقہ مواد کے جمع کرنے کا اختیار کیا ہو) مصنف کی عین عبارت نقل کر لے۔ ڈاکٹر احمد شبلی کی رائے یہ ہے کہ مطالعہ کرتے وقت یا حوالہ نقل کرتے وقت مصنف کی عبارت کی پر کسی طرح کی تنقید یا رائے زنی نہ کی جائے، لیکن میرے خیال میں بہتر ہے کہ اگر ذہن میں کوئی نئی بات پیدا ہوئی ہے، تو حوالے کی عبارت کے بعد اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا جائے، اور تھیس مرتب کرتے وقت دوبارہ اس پر پورا پورا غور کرے، اگر بات درج کرنے کے قابل ہو تو درج کر لے ورنہ ترک کر دے۔ کیوں کہ اگر اس وقت بالکل اشارہ نہ کیا گیا تو ممکن ہے تھیسس لکھتے وقت ذہن سے یہ بات محو ہو جائے اور جو نیا خیال پیدا ہوا تھا اس کی طرف توجہ نہ ہو، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بڑی بڑی ایجادیں اور اہم تحقیقات کی طرف اکثر اچانک توجہ ہوا کی ہے، اور بعد میں انھیں اتفاقی پیدا ہونے والے خیالات پر تحقیق کرنے سے بہت اہم نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

جب کسی کتاب کا مطالعہ کر لے تو فائل میں جو مخصوص حصہ مصادر کے لیے قرار دیا ہو، اس میں کتاب کا نام تفاصیل کے ساتھ درج کر دیا جائے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی آخذ میں بہت سے حوالے مل جاتے ہیں، اور ان حوالوں کے دیکھنے سے کچھ اور حوالوں کا پتہ چل جاتا ہے، یہاں تک کہ موضوع کے کسی خاص نکتے سے متعلق مکمل مواد فراہم ہو جاتا ہے، حالانکہ ابھی تھیسس ابتدائی منزل میں ہوتی ہے اور دوسرے مسئلوں کو ابھی چھوا بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ اس اعتبار سے اچھا ہے کہ تحقیق کی ابتدا ہی میں موضوع کی کسی خاص نکتے کی بحث سے طالب علم

فارغ ہوجاتا ہے۔ اور اپنی سعی کو تکمیل تک پہونچتے دیکھ کر اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔

کبھی پہلی صورت کے بالکل برعکس کسی مسئلہ سے متعلق کوئی نکتہ ملتا ہے اور جب اس کی تحقیق کے سلسلہ میں مطالعہ آگے بڑھتا ہے، تو موضوع کے دیگر مسائل سے متعلق کچھ باتیں نظر پڑتی ہیں ایسی صورت میں ان باتوں کو چھوڑ کر اپنے زیر بحث نکتہ کی تلاش میں آگے نہ بڑھنا چاہیئے، بلکہ جن جن فصلوں کے متعلق جو باتیں نظر آئی ہوں ان کے ضمن میں فوراً ان کو لکھ لیا جائے یا کم از کم ان کے محل وقوع کی طرف اشارہ کر دیا جائے کیونکہ جس مسئلہ کی جستجو میں تھا اگر اسی کے پیچھے پڑا رہا اور مطالعہ میں آنے والی دیگر باتوں کی طرف توجہ نہ کی، تو ممکن ہے جب ان کا موقعہ آئے تو طالب علم کے ذہن میں وہ مقامات جہاں یہ نکتے موجود تھے، محفوظ نہ رہیں اور دوبارہ تلاش میں پھر سے محنت کرنا پڑے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ذہن سے ایسے اتریں کہ پھر مل ہی نہ سکیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضمن مطالعہ، وہ بات سامنے آتی ہے جو اس باب یا فصل سے متعلق ہوتی ہے، جس کو اسکالر مکمل کر چکا ہوتا ہے۔ اس بات کو بھی چھوڑ نہ دینا چاہیے، بلکہ یادداشت میں نوٹ کر لینا چاہیے تاکہ کتاب پر نظر ثانی کے وقت اس کو مناسب جگہ منسلک کر دیا جائے۔

علمی تجربات و مشاہدات

بعض علمی مسائل کو حل کرنے کے لیے انسانوں یا حیوانات پر عملی تجربوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا موقع اس وقت آتا ہے، جب اسکالر کتابوں اور علمی بحث سے کوئی نظریہ قائم کر لیتا ہے، تو اس کی صحت کو پرکھنے کے لیے، عملی تجربے کے میدان میں آنا ہوتا ہے۔ ۔۔ عملی تجربے سے قبل پوری دقت نظر سے علمی نظریہ قائم کرنا چاہیے، عملی تجربے

کے وقت بھی مکمل توجہ اور دیانت داری ضروری ہے، تجربات سے جو بھی نتائج برآمد ہوں بلا کم و کاست تحریر کرے، اپنے علمی نظریے کے لیے جس کو بڑی محنت سے قائم کیا تھا، اس کے ذہن میں عصبیت نہ ہونا چاہیے، مشاہدہ اور تجربہ چاہے اس کی گذشتہ محنت پر پانی پھیر کر اس کو غلط ہی کیوں نہ ثابت کر دے، مگر اس کو وہی لکھنا چاہیے جو ظاہر ہوا ہو اور اپنے قائم کردہ علمی نظریہ میں مشاہدہ کی بنا پر مناسب ترمیم کر لینی چاہیے، اگر یہ تجربہ کسی حیوان یا انسان سے متعلق ہے تو اس کی پوری تفصیل، مثلاً اس کا سن و سال اسکی صحت کی کیفیت، اس کی صنف و نوع وغیرہ تحریر کرنا ضروری ہے۔

علمی تجربات کو ٹھیک طریقے پر شروع کرنا، اور آخر تک ان کو درست انداز پر جاری رکھنا، اور پورے غور و تامل سے ان کے نتائج کو حاصل کرنا چاہیے۔ آج کل ریسرچ کی دنیا میں مشاہدات اور علمی تجربات کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور تھیسس جو ان پر مشتمل ہوتی ہے اس کو بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ مشاہدات سے کبھی کبھی ایسے نظریات غلط ثابت ہو جاتے ہیں جو بڑے اور مشہور علماء نے بغیر مشاہدے کے قائم کیے تھے۔

علمی گفتگو اور خط و کتابت :- یہ ضروری نہیں کہ سپروائزر موضوع کے ہر جزء کے متعلق مکمل معلومات رکھتا ہے کہ بس اس پر اکتفا کر لی جائے، بلکہ بہت سے ایسے اہل علم موجود ہوں گے، جو سپروائزر سے کہیں زیادہ معلومات اور تجربہ رکھتے ہوں گے لہٰذا موضوع کے مختلف اجزاء کے بارے میں مہارت رکھنے والے علماء سے گفتگو کرنا، اور ان کی معلومات و نتائج افکار سے استفادہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ان ماہرین فن کی گفتگو سے جو نتائج اخذ کیے ہوں، ان کو مرتب کرنے کے بعد دوبارہ دکھا لینا اور تصدیق کرا لینا چاہیے۔

ممکن ہے کچھ ایسے اہل علم ہوں جن سے بالمشافہ گفتگو ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں خط و کتابت کے ذریعہ ان کی آراء سے استفادہ کیا جائے، لیکن سوالات تحریر

کرتے وقت مسئلہ زیر بحث کی پوری توضیح، اور وضاحت طلب سوالات کی سلسلے وار تشریح کر دی جائے۔ اگر جواب خط میں کوئی جزو واضح نہ ہوا ہو، یا ریسرچ اسکالر صحیح مطلب و درک نہ کر سکا ہو، تو دوبارہ خط لکھے یہاں تک کہ تنقیح طلب مسئلہ مکمل طور پر واضح ہو جائے۔

تیسرا باب

مواد کی جمع آوری اور ترتیب

مواد کی جمع آوری: مواد جمع کرنیکے دو طریقے مروج ہیں۔ کارڈ کا طریقہ اور رنگ فائل۔

(۱) **کارڈ کا طریقہ**:۔ دفتی کے برابر کے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں جو عام طور پر ۶ × ۸ کے مل جاتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ریسرچ اسکالر زیادہ حجم کے کارڈ بنوالے مگر سب کو برابر ہونا چاہیے، حوالے واضح طور پر روشنائی سے کارڈ کی چوڑان میں صرف ایک طرف لکھے جائیں گے، اقتباس کا عنوان لکھ دینا بھی مناسب ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کارڈ کے مندرجات کیا ہیں، کارڈ کے آخر میں کتاب، مصنف کا نام اور صفحے کا حوالہ ہو، جب حوالہ کی کتاب پڑھ چکے اور تمام حوالے جمع ہو جائیں، تو وہ تمام کارڈ موضوع کے جس جس جزء سے متعلق ہوں، ان کے لحاظ سے تقسیم کر دیے جائیں۔ موضوع کے ہر باب سے متعلق ڈبے کی طرح کی کوئی چیز مہیا کر لی گئی ہو، جس پر اس باب کا نام تحریر کر دیا گیا ہو اور کارڈوں کو اس کے متعلقہ ابواب میں جمع کر دیا جائے، جیسا کہ تحریر کیا گیا، حوالے جمع کرتے وقت، موضوع سے متعلق جو بات جہاں بھی ملے اس جمع کرے، کسی بات کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ نہ دے۔

(۲) **رنگ فائل**:۔ اس میں دفتی کی جلد لوہے کے حلقوں، یا فیتے کے ذریعہ سے متصل ہوتی ہے، اور اس میں چھید کیے ہوئے اوراق ہوتے ہیں، جن کو ہر جگہ سے نکالا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس فائل کے ابتدائی صفحات میں ابواب کے ا رعنوان اور ہر موضوع کے ضمن میں اس کی فصلوں کی تفصیل اور آخر کے اوراق میں مصادر کی تفصیل، مطبوعہ ہوں ــــ تو مطبع کا نام، زمانہ طبع اور مختصر کیفیت تحریر کی جائے گی، ان دونوں ابتدائی اور آخری اوراق کے درمیان، ترتیب وار ہر باب اور اس کے فصول کے لحاظ سے اوراق تقسیم کر دیے جائیں گے، جس صفحے پر کوئی تفصیل ختم ہو اور دوسری شروع ہو وہاں پر فائل کے کاغذ سے مختلف رنگ کا کاغذ رکھا جائے گا، جس کے سامنے کے رخ پر آنے والی فصل کا عنوان اور پشت کی طرف ختم

ہونے والی فصل کا عنوان درج ہو گا۔ اسی طرح ہر باب شروع ہونے اور ختم ہونے والے باب کا نام تحریر ہو گا۔ زیادہ مناسب ہے کہ ابواب کی تقسیم کے لیے جو کاغذ رکھا جائے، اس کا رنگ فصول والے کاغذ کے رنگ سے مختلف ہو۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر ہر باب اور باب کی فصل کو آسانی سے نکالا جا سکے گا۔ ہر باب میں کچھ اوراق سادے چھوڑ دے جائیں، کیونکہ ممکن ہے دوران مطالعہ میں کسی نئی فصل کے اضافے کی ضرورت ہو۔

فائل کی ترتیب کے بعد مطالعہ شروع کرنے، اور جس باب کی جس فصل کے متعلق کوئی بات نظر پڑے، اس کو اسی کے ذیل میں لکھتا چلا جائے۔

تحریر ایک ہی صفحے پر ہو اور پشت کا صفحہ سادا رہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ اگر کسی فصل کے متعلق مواد زیادہ اکٹھا ہو جائے تو اسی کی مناسبت سے اوراق میں اضافہ کر دینا چاہیے۔

میرے خیال میں اس طرح کی فائل کو کارڈ سسٹم پر مذکورہ ذیل وجوہ سے ترجیح حاصل ہے:۔

(۱) اس طرح مصادر سے مواد جمع بھی ہوتا جاتا ہے، اور فصلوں کے ماتحت تقسیم بھی ہوتا جاتا ہے، کارڈ سسٹم میں جمع کرنے کے بعد تقسیم کے لیے دوبارہ محنت کرنا پڑتی ہے۔

(۲) فائل میں تمام اوراق ایک جگہ محفوظ رہتے ہیں لیکن کارڈ الگ الگ ہونے کی بنا پر گم ہو سکتے ہیں۔

(۳) ریسرچ اسکالر جب کسی نکتے کا اضافہ کرنا چاہے یا کوئی نوٹ لکھنے کیلیے دیکھنا چاہے، تو فائل میں سے اس فصل کو نکال کر محل معین کر لینا آسان ہوتا ہے کارڈوں کی تلاش میں زیادہ وقت لگتا ہے۔

(۴) ایسا بھی ہوتا ہے کہ دورانِ مطالعہ میں کوئی بات نظر پڑتی ہے اور شک ہوتا ہے کہ پہلے لکھ چکا ہے یا نہیں، کارڈوں سے تلاش کے مقابلے میں فائل سے آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

(۵) کارڈوں کا پورا ذخیرہ ہر وقت ساتھ نہیں رکھا جا سکتا، اور رنگ فائل کا ساتھ رکھنا آسان ہوتا ہے۔

(۶) حوالے کی عبارت اگر زیادہ طولانی ہو جو ایک کارڈ پر نہ آئے تو دو تین کارڈوں پر الگ الگ لکھنا ہوگی جو منتشر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن فائل کے اوراق میں گنجائش زیادہ ہوتی ہے لہٰذا وہ ایک ہی جگہ آ سکتی ہے۔

اوراق بہت زیادہ ہو جائیں، اور دوسرا فائل بنانے کی ضرورت محسوس ہو تو مقدمے اور مصادر کے حصول کے پہلے ہی فائل میں رکھنے کے بعد کچھ ابواب مکمل طور پر دوسرے فائل میں منتقل کر لیے جائیں تاکہ ہر باب اور ہر فصل ایک جگہ مرتب رہے۔

اسلوب کی تعدیل: جب موضوع کے ہر جز کے متعلق تمام ممکن الحصول مواد، کارڈس یا فائل میں جمع ہو جائے، تو تھیسس شروع کرنے سے قبل، مرتب کردہ ابواب و فصول پر ایک نظر ڈال لی جائے، چونکہ ریسرچ اسکالر کو پہلے موضوع کے متعلق اجمالی علم تھا، اور اسی کے لحاظ سے اس نے تھیسس کا عنوان اور ابواب و فصول کی ترتیب قائم کی تھی۔ اب تفصیلی معلومات اکٹھا ہو گئی ہیں تو ممکن ہے اسکو تھیسس کے عنوان کی تبدیلی یا بعض ابواب، و فصول میں کمی یا اضافے، یا ان کے عنوان، یا ترتیب میں تغیر کرنا مناسب معلوم ہو، اس آخری مطالعے اور مذکورہ بالا تبدیلیاں کرنے کے بعد اپنے سپروائزر کو دکھالے، اگر وہ مطمئن ہو تو تھیسس لکھنے کی باری آتی ہے۔

تھیسس کا عنوان تبدیل کرنا ضروری معلوم ہو تو اس کے قبل قانونی کارروائی،

یعنی یونیورسٹی سے تبدیلی کی اجازت لینا ہوگی۔ اگر سپروائزر کو اعتراض نہ ہو تو عام طور پر اس طرح کی اجازت مل جایا کرتی ہے۔

کتابت کی منزل:۔ جو کچھ مواد مختلف ماخذ سے اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طباخ کے سامنے نمک، مصالحہ اور دوسرا ضروری سامان موجود ہو، یہ چیزیں تو ہر ایک کے لیے مہیا ہو سکتی ہیں، مگر ان کو کس طرح اور کتنا استعمال کر کے کھانے میں مزہ پیدا کیا جائے، اسی میں مہارت فن کی جانچ ہوتی ہے:۔ یوں ہی جو مواد اکٹھا ہو گیا اس کو کوئی اسکالر بھی محنت کر کے جمع کر سکتا تھا، مگر اب اس کو صرف کیوں کر کیا جائے۔ اور اس سے کام کس طرح لیا جائے، اسی میں اسکالر کی ذہانت، طباعی اور مہارت فن کی جانچ ہوگی۔

مواد اکٹھا کرتے وقت ہر مطلب دیا لیس جمع ہو گیا تھا، لیکن تھیسس میں تو سب کوڑا کرکٹ جمع نہیں کیا جا سکتا، پھر اگر موضوع ایسا ہے جس کے بعض جزئیات پر تحقیق و تنقید کر کے، کچھ پہلو پیش کیے جا چکے ہیں تو دوبارہ انھیں باتوں کو نقل کر دینا کوئی قابل تعریف کام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ پوری توجہ سے دیکھیے کہ جمع شدہ مواد میں کون باتیں تھیسس میں شامل کرنے کے قابل ہیں اور کون ترک کر دینے کے لائق ہیں۔ انتخاب کرتے وقت جدید، اور تازہ باتوں اور ان چیزوں کو جو غیر مشہور بھی اور عام نہ ہوں، مصادر کی اہمیت لحاظ رکھتے ہوئے موضوع کے اثبات میں جن چیزوں کا دخل ہو انھیں کو لیا جائے گا، یقیناً ریسرچ اسکالر کو بعض اوقات یہ کھلتا ہے کہ جس مواد کو اتنی محنت سے جمع کیا ہے اس کو ترک کر دیا جائے، لیکن اس کی یہ محنت ضائع نہیں ہوگی بلکہ علم میں اضافہ اور ذہن میں جو روشنی پیدا ہوئی وہ اس محنت کی سب سے بڑی قیمت ہے، ملکہ ممکن ہے کہ جو مواد موضوع سے زیادہ متعلق نہ ہونے کی بنا پر ترک کر دیا گیا ہے وہ کسی دوسرے موقع پر بہتر طریقے سے کام آجائے۔ بہر صورت تھیسس لکھتے وقت

غیر متعلق اور کمزور باتوں کو درج کر کے تھیسس کی اہمیت اور وقعت نہ گھٹانا چاہیئے۔
جب تھیسس لکھتے وقت زمانے کی ترتیب کا لحاظ رکھے یعنی جو واقعات پہلے پیش آئے ہیں ان کو پہلے، اور جو بعد کے ہیں ان کو بعد میں لکھا جائے۔

جو متضاد اور متعارض نصوص سامنے آئیں ان میں مقابلہ کرتے وقت ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں پوری توجہ کرنی چاہیے۔ صرف کسی فرد کی شخصیت سے متاثر ہو کر رائے اختیار نہ کی جائے۔ دیکھنے والے پر یہ تاثر نہ ہو کہ اسکالر نے صرف دوسروں کے اقوال نقل کر دیے ہیں بلکہ یہ معلوم ہو کہ خود بھی قوت فیصلہ اور ذاتی رائے رکھتا ہے۔

اگر ریسرچ اسکالر چاہے تو ہر باب سے پہلے مختصر سا مقدمہ اس پر لکھ سکتا ہے جس میں بتا دے کہ بحث و انتقاد کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، یہ ضروری ہے کہ ہر فصل کے اختتام پر حاصل کردہ نتائج بحث کو پیش کر دیا جائے، اگر یہ نتائج یقینی ہیں تو قطعی صورت سے اور اگر تحقیق ابھی آخری منزل تک نہیں پہونچی ہے تو یہ تحریر کرنے میں جھجک محسوس نہ کرے کہ اب تک جو میں سمجھ سکا ہوں، اور جو مجھے معلومات حاصل ہو سکیں ہیں وہ یہ ہیں ممکن ہے کہ آئندہ میں خود، یا کوئی دوسرا محقق اس بحث کی روشنی میں قدم بڑھائے۔

جب تھیسس میں کسی ایسی بات کو رد کرنا ہو جو مشہور رہے، اور عام طور پر تسلیم کیجاتی ہے، تو اس کے لیے یہ انداز اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے ابتدائی اور سطحی دلیلیں، پھر ان سے قوی اور آخر میں قوی تر دلیلیں بہ ترتیب ذکر کرے۔ تاکہ ابتدائی مرحلے میں مطالعہ کرنے والا شک کی منزل تک پہونچے اور آخر میں قوی دلیلوں سے اسکالر کی رائے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

اسکالر کو غیر متعلق باتوں سے بچنا چاہیے کیونکہ اس سے ربط اور سلسلۂ کلام ٹوٹ جاتا اسی طرح کسی ایسی فصل کا اضافہ جو موضوع سے پورا تعلق نہ رکھتی ہو، یا فصل میں ایسے حصے کو بڑھا

دینا جو دوسرے حصوں سے میل نہ کھاتا ہو، یا عبارت میں ایسے جملے لانا جو زائد ہوں، طرز انشار کے کمزوری کی دلیل ہے۔

تھیسس کے لیے رول دار کاغذ کا استعمال بہتر ہوتا ہے جس کے داہنی طرف اچھا خاصہ حاشیہ چھوڑنا ہے، تحریر ایک ایک سطر کا فاصلہ چھوڑ کر صرف ایک صفحے پر لکھے ہر صفحے کے نیچے بھی حواشی کے لیے اچھی خاصی جگہ باقی رکھی جائے۔

بعض اوقات کسی مضمون کو لکھ چکنے کے بعد کسی نکتہ کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اگر وہ بات ایک سطر یا اس سے کم ہو، تو سطروں کے درمیان جو خالی جگہ چھوڑ دی گئی تھی اس میں مرتبط محل پر کراس (×) کے نشان یا کسی اور نشان کے ذریعہ سے اشارہ کر کے لکھ دی جائے۔ اگر ایک سطر سے زیادہ ہو تو ورق کے داہنی طرف جو حاشیہ چھوڑا گیا تھا، اس پر مقام ربط کی تعین کے لیے نشان بنا کر لکھی جائے۔ لیکن اگر بات اتنی مفصل ہو جس کی حاشیہ پر بھی گنجائش نہ ہو، تو اس صفحہ کو بے کار کر کے مضمون دوبارہ مع اس اضافہ کے لکھا جانا چاہیے۔ اسکالر جو لکھ چکا ہے اس کو بار بار پڑھتا رہے، اور مطالعہ بھی اس نقطہ نظر سے نہ ہو کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں وہ ٹھیک ہی ہوگا بلکہ ہر نظر ناقدانہ ہو۔ جہاں بھی کوئی کمزوری دکھائی دے چاہے وہ مواد میں ہو، یا دلیل، و نتیجے میں اس کو درست کرتا جائے، پوری کوشش ہونا چاہیئے کہ تھیسس خوب سے خوب تر پیش کرے۔

زبان کے قواعد اور انداز نگارش: تھیسس کا تعلق چاہے کسی علمی موضوع سے ہو یا ادبی سے، اس کو زبان کے قواعد اور املے کے لحاظ سے درست ہونا چاہیے، اگر کسی لفظ کی صحت میں شک ہو تو واقف کاروں سے تصحیح کر لی جائے۔ سپر وائزر کا یہ کام نہیں کہ وہ املے اور انشار کی غلطیاں درست کرتا رہے۔

علمی موضوعات مثلاً طب، ریاضی، وغیرہ پر جو تھیسس لکھی جائے اس میں ادبیت کی زیادہ ضرورت نہیں صرف مطلب صاف اور واضح ہو، ہاں جو تھیسس ادبی موضوعات پر لکھی گئی ہو، اس کا طرزِ نگارش خوبصورت اور ادبی ہونا چاہیے۔ طرزِ نگارش کی خوبصورتی کا یہ مطلب نہیں کہ عبارت رنگین ہو، یا قافیہ پیمائی کی جائے، یا نامانوس الفاظ لائے جائیں اس طرح کی لفاظی، تحقیقی مضامین سے میل نہیں کھاتی، بلکہ خوشنمائی کا مطلب یہ ہے کہ لفظوں کا انتخاب، جملوں کی بندش اور جملوں سے عبارت، سوچ سمجھ کر بنائی جائے۔

مذکورہ امور کی تشریح :- لفظیں اور جملے :- اسکالر کو اس زبان پر پورا عبور ہو، جس میں تھیسس لکھ رہا ہے، جن معنوں کو ادا کرنا ہو ان کے لیے ایسے الفاظ منتخب کرے جس سے وہ پوری طرح ادا ہو جائیں۔ اگر ایک ہی معنوں کی قریب قریب تکرار ہو، تو مرادف الفاظ سے ان کو ادا کرے، تاکہ ایک لفظ کا بار بار آنا ذہن پر بار نہ ہو، عام فہم اور مروج الفاظ استعمال کیے جائیں۔ قدیم۔ متروک الفاظ یا بالکل جدید الفاظ کو (جو ابھی عام نہ ہوئے ہوں) ترک کرنا چاہیے۔ ہاں اگر کسی قدیم زمانے کے شاعر یا کسی بالکل جدید رنگ کے شاعر پر تھیسس لکھنا ہو تو اس کے استعمال کردہ ان الفاظ کو لے آنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، جو مبہم نہ ہوں اور ذہن پر بار نہ ہوتے ہوں' اجنبی الفاظ، اور تعقید سے کلام میں خشکی اور پڑھنے والوں میں دل تنگی پیدا ہوگی۔ سوائے کسی فن کی مخصوص اصطلاحات کے (جن کے بغیر وہ معنی ادا نہ ہوتے ہوں) اجنبی الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ اس قسم کی اصطلاحات استعمال کرتے وقت ان کی تشریح بھی صفحے کے نیچے حاشیہ پر کردی جائے۔ محل اور موقعہ کی مناسبت سے کبھی فعل کو اسم پر، کبھی اسم کو فعل پر، کبھی خبر کو مبتدا پر، کبھی مبتدا کو خبر پر، مقدم کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل "علم بیان" سے معلوم ہوسکتی ہے۔ ادائے

مطلب کے لیے جملوں میں کم سے کم لفظیں لائی جائیں، فاعل اور فعل، مبتدا اور خبر میں زیادہ فاصلہ نہ ہو، تاکہ مطالعہ کرنے والا حکم کے متعلقات کو آسانی سے سمجھ لے۔ علی العموم چھوٹے چھوٹے جملوں کو طولانی جملوں پر ترجیح ہوتی ہے۔

طرزِ نگارش:۔ اگر کہیں کہیں عبارت مسجع ہو جائے تو اس سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ یہ محسوس نہ ہو کہ قافیہ پیمائی کی کوشش کی گئی ہے، آمد ہی آمد ہو، آورد نہ ہو۔ جملے ایک دوسرے سے مرتبط ہوں، مشہور اور پیش پا افتادہ مثلوں اور اشعار کا لانا مقیس کے وزن کو ہلکا کر دیتا ہے، ایک ہی مطلب کی تکرار زبردست عیب ہے، ہاں بعض اوقات کسی مطلب کا دوبارہ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے ایسی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے، کہ زیادہ مناسب موقع پر پوری تشریح کر دی جائے اور دوسرے محل پر صرف اشارہ کر دیا جائے۔ (مثلاً اس کی تشریح فلاں صفحے، سطر، پر گذر چکی، یا فلاں صفحے پر آئندہ آئے گی۔)۔

طرزِ نگارش کا حسن یہ ہے کہ ہر جملہ بعد والے جملے سے دست و گریباں ہو، کڑی سے کڑی ملتی جائے، عبارت سادی ہو جس میں تعقید نام کو نہ ہو، مختصر عبارت میں مطلب ادا کیا جائے، پڑھنے والا ہر جملے سے لطف لے اور محسوس کرے کوئی 'نئی' بات معلوم ہو رہی ہو، جب بھی اسکالر کو اس بات کا اندازہ ہو کہ مطلب ادا ہو گیا، وہیں پر رک جائے بلا سبب ایک سطر کا بھی اضافہ نہ کرے۔

بہتر ہے کہ ایک فصل لکھنے کے بعد عبارت بلند آواز سے پڑھی جائے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں کہیں جھول تو نہیں آیا ہے یا الفاظ سماعت پر بار تو نہیں ہوتے ہیں۔

اسلوب اور طرزِ نگارش سے جہاں عبارت کی لطافت اور اس کا تسلسل مراد لیا جاتا ہے، وہیں یہ معنی بھی ہیں کہ مواد عمدہ طریقہ سے پیش کیا گیا ہو، نتائج

بہتر انداز سے اخذ کیے گئے ہوں۔ غرض تمام وہ باتیں داخل ہیں، جن سے تصنیف لفظی اور معنوی اعتبار سے زیادہ قوی اور موثر ہو سکے، اور اس کے لیے حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) جو باتیں مسلّم ہوں، یا آسانی سے تسلیم کی جا سکتی ہوں، ان کے لیے دلیلوں کی بھرمار ضروری نہیں، جس بات کے جتنی آسانی یا مشکل سے تسلیم کیے جانے کا احتمال ہو، اسی مناسبت سے دلیلیں پیش کی جائیں۔

(۲) مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا جائے۔

(۳) عبارت میں تحکم یا مذاق اڑانے کا انداز نہ ہو، کیوں کہ یہ طریقہ علمی کتابوں کے لائق نہیں۔

(۴) ایسی باتوں سے پرہیز کیا جائے، جن سے اختلافات کے دروازے کھلنے کا امکان ہو۔ یہ مواقع ایسے ہوتے ہیں، جن میں اسکالر کی مہارت پرکھی جا سکتی ہے۔ کوئی اہم حقیقت چھوٹنے بھی نہ پائے۔ اور اختلافی مسائل میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کرے کہ اپنے کو کسی مشکل میں پھنسائے بھی نہیں۔ کسی محقق کے لیے یہ زیبا نہیں کہ جھگڑے میں اپنا دامن الجھائے۔ دوسروں کی رائے سے اختلاف ایسے مناسب انداز اور احترام کو ملحوظ رکھ کر ہو کہ شکایت کے مواقع نہ پیدا ہوں۔

ضمائر: ضمیر متکلم یا مخاطب سے ان مواقع پر بچنا چاہیے جہاں کبر و تفاخر کا شائبہ پیدا ہو، جیسے: "ہم یہ سمجھتے ہیں"۔ "میں یہ کہتا ہوں"۔ "پڑھنے والے یقیناً یہی فیصلہ کریں گے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ اپنی رائے پیش کرتے وقت انداز میں انکسار ہو۔ مثلاً: "اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے"۔ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے"۔ وغیرہ

پیراگراف: چند جملوں کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں، جس سے کوئی بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہو، لیکن اس کے لیے کسی مستقل عنوان کی ضرورت نہ ہو، بلکہ یہ اپنی طرح کے دوسرے

پیراگرافوں سے مل کر کسی عنوان کو مکمل کرتا ہو۔ چونکہ پیراگراف خود اپنی جگہ ایک استقلالی، وجود رکھتا ہے، لہٰذا اس کو ایسا ہونا چاہیے کہ مختصر یا ضمنی مسئلہ کہا جا سکے اس میں استقلال کے تمام عناصر پائے جاتے ہوں۔ اور مخصوص خیال کے متعلق واضح نتیجہ نکلتا ہو۔ پیراگراف نہ تو بہت طولانی ہو، نہ بہت مختصر۔ اس کے جملے ایسے مربوط ہوں کہ ہر بعد والا جملہ پہلے جملے کا پتہ دے رہا ہو اور پہلا بعد والے کا مقدمہ معلوم ہو، چونکہ یہ اپنی جگہ مستقل ہوتا ہے، لہٰذا تحریر میں بھی اس کا اظہار اس طرح ہو کہ ہر پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا جائے، جب ختم ہو تو ایک چھوٹی سی لکیر ختم کی علامت کے بطور کھینچ دی جائے۔ بعض مصنفین ایک پیراگراف ختم ہونے اور دوسرا شروع ہونے کی علامت کے طور پر ایک سطر بیچ میں چھوڑ دیتے ہیں۔

اقتباسات :۔ اقتباسات کے لیے بھی خاصی مہارت درکار ہے۔ حسبِ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔

(۱) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، کہ کن مصادر کو اقتباس کے لیے منتخب کیا جائے۔ اصلی مصادر ہوں، اور ان کے مولف قابلِ اعتماد ہوں۔

(۲) نقل کرنے میں اس کا خیال رکھا جائے، کہ ان کی عین عبارت نقل ہو، تغیر و تبدل نہ ہونے پائے، عبارت کو قوسین کے درمیان قرار دیا جائے۔ اگر ایک پیراگراف سے زیادہ کا اقتباس ہو۔ تو پہلے پیراگراف کے شروع میں، اور آخری پیراگراف کے اختتام پر قوسین بنائی جائیں۔ زیریں حاشیے میں اشارہ کیا جائے۔ کہ اقتباس کتاب کے کس مقام سے لیا گیا ہے۔

(۳) اقتباس سے پہلے اور بعد مقتبس کی عبارت اس طرح مربوط ہو کہ تنافر محسوس نہ ہو۔

(۴) اتنی کثرت سے اقتباس نہ ہوں کہ کتاب صرف ان کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ اور خود اسکالر کی شخصیت دب جائے۔ ہر اقتباس کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر کرتا جائے۔

(۵) محققین نے اقتباسات کے حجم کے لحاظ سے، حسب ذیل نظام مقرر کیا ہے :۔ اگر اقتباس بہت بڑا نہ ہو، اور چھ سطروں کے اندر ہو، تو جزو رسالہ کے طور پر توسین میں لکھا جائے۔ اگر چھ سطروں سے زیادہ اور ایک صفحہ کے اندر ہو، تو اصل کتاب کی عبارت اور اقتباس میں نسبتاً زیادہ فاصلہ دے کر، صفحے کے داہنی اور بائیں جانب زیادہ جگہ چھوڑ دی جائے، اور قلم عام تحریر کے مقابلہ میں ذرا خفی کر دیا جائے۔ اگر ایک صفحے سے بھی زیادہ ہو، تو لفظ بلفظ نقل کرنے کے بجائے، اس کا مطلب اپنے لفظوں میں ادا کرے :۔ حاشیہ پر لکھ دیا جائے، کہ یہ مطلب فلاں کتاب کے فلاں حصہ سے لیا گیا ہے۔

(۶) اقتباس کتابوں اور رسالوں کے علاوہ، بالمشافہ گفتگو یا خطوط کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس صورت میں، صاحبِ اقتباس سے اجازت حاصل کر لینا ضروری ہے۔ کہ وہ نشر و طبع پر راضی ہے۔

(۷) اگر کسی مصنف کی رائے رد کرنے کے لیے نقل کی جا رہی ہو، تو تحقیق کر لینا چاہیے کہ اس نے یہ رائے دوسرے ایڈیشن یا بعد کی کتاب میں بدل تو نہیں دی ہے۔

(۸) اسکالر کے لیے ضروری نہیں کہ پوری عبارت نقل کرے، کسی لفظ یا جملے کو حذف کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے اصل مطلب متاثر نہ ہوتا ہو، لیکن اس صورت میں۔ محل حذف پر (بالعموم ۳) نقطے دیے جاتے ہیں۔ اگر ایک پورا پیراگراف نقل کر کے بیچ کا پورا پیراگراف چھوڑنا ہو، اور پھر تیسرا پیراگراف نقل کرنا ضروری ہو، تو ایک پوری سطر پر نقطے دے دئے جائیں، پھر نئی سطر سے بعد والا پیراگراف شروع کیا جائے۔ بعض اوقات ضرورت ہوتی ہو کہ اقتباس کے درمیان ہی میں ایک یا کئی لفظوں کا اضافہ تشریح کے لیے کیا جائے، تو ان زائد لفظوں کو بریکٹ کے [ ] درمیان لکھا جائے۔

تفریع :۔ اگر کسی مسئلہ میں کچھ اصل باتیں ہوں اور ان اصلوں میں کچھ فرعیں پیدا ہوتی

ہوں، اور فرعون میں کبھی کچھ فرعین ہوں۔ تو انداز تحریر ایسا ہونا چاہیئے کہ یہ تقسیم، اور تقسیم در تقسیم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اور اشتباہ پیدا نہ ہو کہ کون اصل ہے اور کون فرع یا فرع در فرع اگرچہ یہ بات صرف انداز تحریر سے متعلق ہے لیکن مسئلہ کی توضیح میں اس کا بہت دخل ہے مثلاً اگر مسئلہ کے متعلق تین بنیادی باتیں ہوں، اور ان سے متعلق کچھ فرعیں ہوں تو تحریر میں مذکورہ ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

اولاً۔ شاخوں کی سطریں اصل کے مقابلہ میں ذرا دبا کر شروع کی جائیں۔

ثانیاً۔ ہر درجہ کی شاخوں کو بالکل ایک دوسرے کی محاذات میں تحریر کیا جائے۔

ثالثاً۔ تقسیم میں نمبروں لفظوں، حرفوں کا اس طرح لحاظ رکھا جائے کہ ظاہر ہو جائے ان میں اصل کیا ہے اور اس سے نکلنے والی فرعیں کون ہیں۔

حسب ذیل مثال سے مطلب واضح ہو جائے گا۔

مصالح عامہ کے لیے اسلام نے آمدنی کے حسب ذیل ذرائع قرار دیے ہیں۔

اولاً۔ زکوٰۃ اور وہ حسب ذیل اشیاء میں واجب ہوتی ہے۔

الف۔ اموال۔

ب۔ سامان تجارت۔

ج۔ چرنے والے جانوروں میں سے ان جانوروں میں۔

۱۔ اونٹ، اگر کم سے کم پانچ ہوں۔

۲۔ گائیں، کم سے کم تین ہوں۔

۳۔ بکریاں، کم سے کم چالیس ہوں۔

د۔ وہ زکوٰۃ جو کھیتی باڑی سے متعلق ہے۔

۱۔ اگر بارش سے سینچائی ہوتی ہو، تو دسواں حصہ

۲۔ اگر کنویں وغیرہ سے سینچائی ہوتی ہو، تو بیسواں حصہ

ثامنا۔ جزیہ:۔ وہ ٹیکس جو معینہ شرائط پر اہلِ کتاب سے لیا جاتا ہے۔

ثالثا۔ عشور۔ وہ ٹیکس جو برآمدی اور درآمدی اموالِ تجارت پر لگایا جاتا ہے۔

رابعا۔ خراج:۔ یعنی وہ ٹیکس جو غیر مسلموں کی زرعی زمینوں پر لگایا جاتا ہے۔

خامسا۔ خمس:۔ مالِ غنیمت اور معدنیات وغیرہ کا پانچواں حصہ (شیعوں کے نزدیک بچت کا بھی پانچواں حصہ۔)

سادسا۔ ایسے لوگوں کا ترکہ جن کا کوئی وارث نہ ہو۔

القاب:۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ تحقیق میں جب کسی شخص کا ذکر آئے، تو صرف اس کا نام لکھا جائے گا، القاب اور عہدوں کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً ابن اثیر کا خیال ہے، طٰہٰ حسین کا یہ نظریہ ہے۔ لیکن اس وقت لقب یا عہدے کا لکھنا ضروری ہوتا ہے، جب کہی جانے والی بات کا، لقب یا عہدے سے خاص ربط ہو۔ مثلاً بنی امیہ کے مظالم لکھے جا رہے ہوں، تو یوں لکھا جائے گا۔ عبد الملک کے گورنر حجاج نے یہ کیا، یا کسی فرقہ کے متعلق کچھ لکھنا ہو تو یوں لکھا جائے گا کہ اس فرقے کے امام یہ کہتے ہیں، مگر جب تذکرہ ایسے موقع پر آئے، جہاں عہدے یا لقب کا دخل نہ ہو تو صرف نام لکھنا چاہیئے۔ ہاں حسبِ ذیل مقامات پر القاب کا تذکرہ کیا جائے گا۔

(۱) جب کتاب کے مآخذ کا ذکر کیا جائے تو مصنف کا نام القاب سمیت لکھا جائے گا۔

(۲) تحقیق کی تکمیل کے سلسلے میں کسی شخص کی امداد اور اس کے تعاون کا شکریہ ادا کیا جائے، تب بھی اس کے عہدے کا ذکر کیا جائے گا، مثلاً فلاں لائبریری کے لائبریرین صاحب کا میں ان کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں۔"

(۳) اس موقعے پر بھی عہدے وغیرہ کا (ایسی باتیں جس سے شخصیت پر روشنی پڑتی ہو) ذکر کیا جائے گا جب کسی غیر مشہور شخص کی رائے، تائید، یا رد کے لیے نقل کی جا رہی ہو، تاکہ پڑھنے والا یہ سمجھ سکے کہ جس شخص کی رائے سے تعرض کیا گیا ہے، اس قابل ہے کہ

اس کی رائے تقدیس میں ذکر کی جائے، لیکن اس صورت میں لقب یا عہدے کا ذکر اصل کتاب کے بجائے حاشیہ پر ہونا چاہیے۔

(۲) کبھی کبھی کوئی لقب اس طرح مشہور ہو جاتا ہے کہ بغیر اس لقب کے پہچاننا مشکل ہوتا ہے، بلکہ لقب کی شہرت کے مقابلہ میں نام دب جاتا ہے، ان مواقع پر القاب کا ذکر کرنا ضروری ہے، جیسے :- علامہ حلی، محقق طوسی، غفران مآب وغیرہ،

لقب یا عہدے کے ترک کرنے سے اس شخص کی تعظیم یا احترام میں کمی مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برخلاف اسکی عظمت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے، یعنی اسکی شخصیت القاب سے مستغنی ہے، صرف نام ہی سے پڑھنے والے اس کی بلندی مرتبہ کو محسوس کرلیں گے، لہذا القاب کا ذکر ضروری نہیں ہے

مختصرات اور اشارے :- بعض مخصوص کلمات اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ ان تصریح کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کی طرف صرف اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جیسے "ق" "م" سے قبل مسیح مراد ہونا، "م" یا "ع" سے، عیسوی سنہ مراد ہونا۔

علامات تحریر، Puncuations کتابت کے لیے کچھ ایسی علامتیں مقرر ہیں، جن سے جملوں کے مرتبط یا الگ ہونے کا پتہ چلتا، آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کا علم ہوتا ہے، ان علامات کا تقدیس میں لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ ان کے بغیر مطلب کے الٹ پلٹ ہو جانے کا امکان ہے، نحوی، صرفی قواعد، املاء و انشاء کے اصول کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ دوسری کتابوں میں معلوم ہو سکتے ہیں، لہذا ان سے بحث نہیں کی گئی ہے، ہاں علامات تحریر اور اشارات کو آخر کتاب میں ضمیمہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ علامات ترقیم کے علاوہ، عربی اور اردو عبارات میں، بعض مواقع پر، اشتباہ کو دور کرنے اور معنے معین کرنے کے لیے اعراب دینے کی ضرورت ہوتی ہے، مناسب ہے کہ تقدیس لکھنے کے بعد خود بلند آواز سے پڑھے، اور

بہتر صورت یہ ہے کہ دوسرے سے اپنے سامنے پڑھوائے، اور پڑھتے وقت خود کو، اور پڑھوانے کی صورت میں پڑھنے والے کو جہاں رکاوٹ محسوس ہو وہاں اعراب واضح کر دیا جائے، اگر کتاب ٹائپ سے لکھی گئی ہو، تو ٹائپ رائٹر میں تشدید کی علامت تو موجود ہوتی ہے، لیکن دیگر اعراب نہیں ہوتے لہٰذا ٹائپ ہو جانے کے بعد ٹائپ رائٹر والے سے ملتے جلتے قلم سے، ویسی ہی روشنائی سے خود اعراب لگا دیے جائیں۔

حاشیہ :- تین بنیادی باتوں کا حاشیہ میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ ماٰخذ جن سے مواد لیا گیا ہے :- چاہے مطبوعہ کتاب سے ہو، مخطوطے سے ہو، یا انٹرویو سے،

حاشیہ میں ماٰخذ کا ذکر کر دینے سے جن سے استفادہ کیا ہے، ان کے لیے اظہارِ تشکر و امتنان بھی ہو جائے گا۔ یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ موضوع سے متعلق کتنے اہم ماٰخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، اور کتنی زحمت اٹھائی گئی ہے، مطالعہ کرنے والا اگر کسی ملتے جلتے موضوع پر تحقیق کر رہا ہو، تو اس کو ماٰخذ و مصادر کا پتہ چل جائے گا۔

(۲) توضیحات :- تھیسس کے کسی اجمال کی تفصیل یا کسی موضوع کی تحقیق وغیرہ، جن کا بنیادی تعلق تھیسس سے نہ ہونے کی بنا پر اگر اس کو اصل کتاب میں ذکر کیا جاتا، تو ربط و تسلسل باقی نہ رہتا اگر یہ اتنی مختصر ہوں کہ ایک صفحہ کے حاشیہ میں آ جائیں تو حاشیہ میں ان کا ذکر کیا جائے گا۔ اور اگر طولانی ہوں تو ضمیمہ کتاب میں ذکر کیا جائے گا۔ ان توضیحات کا اگر حاشیہ میں ذکر کیا جائے، تو ان کے لیے اشارے کو ماٰخذ کے اشارے سے ممتاز ہونا چاہیے، مثلاً بجائے نمبر دینے کے ستارہ بنا دیا جائے، اور اگر اسی حاشیہ پر دو توضیحیں ہوں تو دو ستارے بنا دیے جائیں۔ اگر ان توضیحات کا تذکرہ ملحقات میں کیا گیا ہو تو حاشیہ پر یہ بیان کر دیا جائے کہ فلاں نمبر کے ملحقات میں توضیح کی گئی ہے۔

تلخیص میں کوئی ایسا مقام آئے، جہاں کبھی ایسے نکتے کی توضیح ضروری ہو جو دوسری جگہ موجود ہے، تو تکرار سے بچنے کے لیے حاشیہ پر اس جگہ کا اشارہ کر دیا جائے جہاں یہ توضیح موجود ہو۔

حاشیے کے نمبر:- حاشیے کے نمبر متعین کرنے کے تین طریقے ہیں۔

(۱) ہر صفحے کا حاشیہ، اسی صفحے پر ترتیب وار نمبر دے کر (۱-۲-۳) لکھ دیا جائے، سب سے سہل اور واضح طریقہ یہی ہے، اس طرح ہر صفحہ اپنی توضیحات اور ماخذ وغیرہ کے لحاظ سے مستقل ہوتا ہے؟ اگر کبھی حاشیہ میں حذف و اضافے کی ضرورت پڑتی ہے، تو اس کا اثر دوسرے صفحات پر نہیں پڑتا۔

(۲) پوری فصل کے حواشی کے لیے، سلسلے وار نمبر قرار دیے جائیں، اب اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو ہر صفحے پر آنے والے نمبروں کو اسی صفحے کے حاشیے پر لکھا جاتا رہے۔ اور یا فصل کے ختم ہونے کے بعد ترتیب وار سب حاشیے لکھے جائیں۔

(۳) پورے تلخیص کے حاشیوں کے لیے مسلسل نمبر قرار دیے جائیں اس صورت میں بھی اختیار ہے کہ نمبروں کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ہر صفحے کے متعلق حاشیے کو اسی صفحے پر لکھ دیا جائے، یا پوری تلخیص کے حواشی اس کے تمام ہونے کے بعد لکھے جائیں۔ آخری دو صورتوں میں خرابی یہ ہے، کہ اگر کسی حاشیہ میں حذف یا اضافے کی ضرورت پڑتی ہے تو بعد کے تمام نمبر بدلنا ہوتے ہیں دونوں صورتوں کی دوسری صورت یہ اور خرابی ہوتی ہے کہ عبارت پڑھتے وقت جب ماخذ یا توضیح دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ورق الٹ کر فصل یا تلخیص کے اختتام میں حاشیے کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔

اصل کتاب میں جو نمبر ڈالے جائیں گے ان کو سطر سے ذرا بلندی پر ہونا چاہیے۔ اور اس کے بعد نقطہ نہیں دیا جاتا ہے۔ جس شخص کا کلام نقل کیا گیا ہے، اگر اس کا نام بھی آ گیا ہے۔ تو نام کے بعد نمبر دیا جائے گا۔ اگر نام نہیں تو جہاں اقتباس ختم ہو وہیں پر نمبر دیا

جائے گا۔

اگر تھیسس ریاضی سے متعلق ہو جس میں اعداد زیادہ ہوتے ہیں، اور حاشیے کی طرف اشارہ کا ان نمبروں کے اعداد سے مشتبہ ہو جانے کا امکان ہو تو حاشیے کی طرف اشارے کے لیے، بجائے نمبروں کے دوسری علامتیں مثلاً، الف، ب، ج قرار دی جائیں۔

کتاب کی اصل عبارت ختم ہونے اور حاشیہ شروع کرنے سے پہلے درمیان میں ایک لکیر کھینچ دی جائے، جس کا فاصلہ کتاب کی عبارت اور حاشیے کی عبارت سے اتنا ہی ہو، جتنا سطروں کا ایک دوسرے سے ہے۔ حاشیے کی سطروں میں بھی برابر کا فاصلہ ہونا چاہیے حاشیے میں نمبر سطر ہی پر دیے جائیں۔ اور پھر ذرا سی لکیر دے کر حاشیے کو تھوڑے فاصلے سے شروع کیا جائے، نمبر بالکل ایک دوسرے کے نیچے ہوں اسی طرح عبارت بھی محاذات میں ہو۔

اگر کسی کتاب کی تالیف میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے، تین آدمیوں تک شریک ہوں تو سب کے نام درج کرنا چاہیے۔ لیکن اگر تین سے زیادہ ہوں تو جس شخص کا تعلق کتاب سے زیادہ ہے، اس کا نام لکھ کر، اور ان کے "شرکا" لکھ دینا کافی ہے اگر کسی کتاب کا مولف معلوم نہ ہو، تو کتاب کا نام لکھ کر "مجہول المولف" لکھا جائے گا۔

اگر اصل تھیسس میں کتاب کے مولف کا نام آچکا ہو تو حاشیے میں تکرار کی ضرورت نہیں، صرف کتاب کا نام لکھنا کافی ہے۔

اگر اصل ماخذ کے حاصل نہ ہو سکنے یا اس کی زبان سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر اقتباس اس کے ترجمے سے لیا گیا ہو تو یوں لکھنا چاہیے "تاریخ طبری، ج ۱، ص ۵۰؛ از ترجمہ فارسی مطبوعہ نول کشور۔

اگر اقتباس کسی رسالے یا ڈائجسٹ وغیرہ سے ہو، تو مضمون کی سرخی، لکھنے والے کا نام رسالے کا نام، جلد، نمبر شمار، اور اس صفحے کا نمبر جس سے مضمون کی ابتدا ہوئی، یہ تمام تفصیل لکھی جائے۔

اگر کسی مخطوطے کا اقتباس ہو، تو مخطوطہ کس جگہ ہے، اگر کسی کتاب خانے میں ہے تو نمبر وغیرہ لکھا جائے۔

اگر کسی انٹرویو یا تقریر کا حوالہ ہو تو اس شخص کا نام، جس سے انٹرویو لیا گیا ہے، یا تقریر کی تاریخ، اور اجازت حاصل کر لینے کی تشریح ہونا چاہیے۔ (اگر انٹرویو یا تقریر، عام طور پر نشر ہو چکی ہو؛ تو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس رسالے یا اخبار کا حوالہ دینا کافی ہے جس میں نشر ہوئی ہو۔)

اگر ایک ہی ماخذ کی تکرار ایک صفحے میں پے در پے کئی جگہ ہو تو پہلے حوالے کے بعد صرف "مذکورہ ماخذ، ص ......" لکھا جائے گا۔

اگر کوئی کتاب اور مصنف مشہور رہوں تو کتاب کا مکمل عنوان اور مصنف کا پورا نام لکھنے کی ضرورت نہیں، مثلاً ابو الحسن الہلال بن المحسن بن ابراہیم الصابی' تحفۃ الامراء فی التاریخ الوزراء، ص ...... کے بجائے: الصابی۔ تاریخ الوزراء، ص ......، لکھ دینا کافی ہوگا۔

اگر اسکالر کو پے در پے ایک ہی کتاب کے کئی صفحوں کا حوالہ دینا ہوگا تو صفحات کے پورے نمبر بھی لکھے جا سکتے ہیں، ص ۸ ، ۲۱۹ ، ۲۲۰ ، اور اختصار بھی کیا جا سکتا ہے، اس میں حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

(۱) اگر نمبر صرف اکائی اور دہائی پر مشتمل ہوں تو اختصار کی گنجائش نہیں۔ مثلاً ص ۵۱ ، ۵۷ ۔

(۲) جب صفحات کے نمبر سیکڑوں یا ہزاروں تک پہنچ جائیں اور بعد کے صفحات میں صرف اکائیوں اور دہائیوں کا فرق ہو تو دوسرے حوالے میں ان اکائیوں اور دہائیوں کا ذکر کافی ہوگا، ص ۳۲۷ — ۲۹ یعنی ۳۲۹ ۔ یا مثلاً، ص ۱۳۷۵ - ۷۷ یعنی ۱۳۷۷

ہاں اگر سیکڑے اور ہزار میں بھی فرق ہو تو پورے نمبر دینا ہوں گے مثلاً، ص ۵۹۸ — ۶۰۱

اگر سیکڑے کے مقام پر علاوہ کے بجائے صفر ہو تو ہزار کے عدد کی تصریح ضروری ہوگی مثلاً:۔ ص ۱۰۰۰ - ۱۰۰۳ -

اگر کسی ایسی بات کا تذکرہ ہو جو حوالہ کی کتاب میں متعدد جگہ آئی ہو، تو صفحے یا صفحات کے حوالے کے بغیر یہ لکھنا بھی کافی ہے کہ مثلاً:۔ دیکھو کتاب سیوطی کے مختلف مقامات۔

اگر تھیسس میں کوئی جدول ہو اور اس کے متعلق کسی حاشیے کی ضرورت ہو، تو اس صفحے پر حاشیے لکھنا چاہیئے جس پر جدول ہو، اگر جدول کا صفحہ کتاب کے صفحے سے بڑا ہو یا جدول کئی صفحات پر مشتمل ہو تب بھی حاشیہ، یا حواشی جدول کے ختم کے بعد ہی ہونا چاہیئے۔
چونکہ ماخذ کے مطبع اور سنہ وغیرہ کا تذکرہ کتاب کے آخر میں فہرست ماخذ کے ذیل میں ہونے والا ہے (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) تو ان تمام تفاصیل کی حاشیہ میں ضرورت نہیں۔

اگر حاشیہ پر جو باتیں تحریر کرنا ہیں وہ ایک سطر میں مکمل نہ ہوں تو دوسری سطر بالکل پہلی سطر کے نیچے نمبر کے بعد جتنی جگہ چھوڑ کر پہلی سطر شروع کی گئی تھی وہیں سے شروع کی جائے گی۔ یعنی دوسری سطر کی عبارت، پہلی سطر کی عبارت کے بالکل محاذات میں ہوگی۔
اعداد کا استعمال:۔ تھیسس میں اگر اعداد کا تذکرہ کرتا ہو، تو اگر وہ تین لفظوں میں ادا ہو جائیں تو ان کو الفاظ ہی میں لکھنا چاہیئے۔ مثلاً ایک ہزار، دو سو پچاس۔ لیکن اگر تین لفظوں سے زائد ہوں تو ان کو اعداد میں لکھا جاتا ہے۔ جیسے، ۵۵۷۵، ۱۱۔ لیکن کچھ اعداد ایسے بھی ہیں اگرچہ تین لفظوں میں ادا ہو جاتے ہوں پھر بھی ان کو اعداد ہی میں لکھا جاتا ہے:۔ علاوہ اعداد جو مالیت کو ظاہر کر رہے ہوں۔ اردو تھیسس میں مالیت کو ظاہر کرنے والے اعداد کو ان علامتوں میں لکھنا چاہیے جو مالیت کو بتاتی ہیں۔ اور بہتر ہے کہ ان کے اوپر عدد کو میں بھی مالیت کو ظاہر کر دیا جائے، جیسے ۱۲۵۰/ھ ہزار

اسی طرح مکان، سڑک یا ٹیلی فون کے نمبر سنہ اور تاریخ، جدول، تصویروں اور نقشوں کے نمبر سب اعداد ہی میں لکھے جائیں گے۔

ع۲۔ اگر اعداد جملے کی ابتدا میں ہوں تو بہر صورت (چاہے تین لفظوں سے تعداد بڑھ ہی جائے) ان کو لفظوں ہی میں ظاہر کرنا چاہیئے۔ مثلاً:۔ ایک لاکھ، پچاس ہزار، دو سو ساٹھ، افراد فلاں جنگ میں ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن حتی المقدور جملے کی ابتدا میں اعداد کو استعمال نہ کرنا چاہیئے۔

ع۳۔ کسر اگر تنہا ہو تو اس کو بھی لفظوں میں لکھا جائے گا۔ مثلاً:۔ آدھا لشکر۔ لیکن اگر عدد کے ساتھ ہو تو اس کو اعداد میں تحریر کیا جائے گا۔ جیسے۔ ۴ ½ بالشت ۱۲ ¾ میٹر؛

اگر اعداد تین سے زیادہ ہوں۔ تو ہر تین عدد کے بعد کاما لگا دینا چاہیئے، جیسے:۔

۱،۵۲۲،۷۵۳۔

جدولیں (نقشۂ اعداد و شمار): بعض اوقات کسی مسئلے کی پوری توضیح و تشریح کے لیے جدولوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً بیان کرنا ہے کہ فلاں صوبے میں فلاں الیکشن میں کسی ایک پارٹی کے مکمل اکثریت نہ حاصل کر سکنے کی بنا پر وزارتیں جلد جلد بنتی اور ٹوٹتی رہیں اور کسی ایک وزارت کو بھی سکون سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ تو اب اس نقشۂ اعداد و شمار سے اس طرح ظاہر کیا جائے گا کہ ہر وزارت کے بننے کی تاریخ، ٹوٹنے کی تاریخ، کتنے دن کام کا موقع ملا، سب ترتیب سے تحریر کیا جائے گا۔ جدول سے پہلے ہیڈ سطر یا تحریر کرنا ہوگی جس میں جدول بنانے کا مقصد واضح کیا جائے گا۔

مثلاً کسی ایک پارٹی کے بھی مکمل اکثریت میں نہ آسکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عہدے کی لالچ میں دل بدلی کر کے، اِدھر اُدھر جاتے رہے، اور کسی وزارت کو بھی اطمینان سے کام کا موقع نہ ملا۔ جلد جلد وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی رہیں، جیسا کہ مذکورۂ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔

بہتر ہے کہ جدول کے صفحے کا طول وعرض مقیس کے صفحات کے برابر ہی ہو لیکن اگر اس میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ جدول کی پوری تفصیل آسکے تو اگر عرض میں تفاصیل زیادہ ہوں تو جدول کے صفحے کی چوڑان بڑھائی جاسکتی ہے اور اگر صفحے کا طول بھی کافی نہ ہو تو جدول کے لیے دوسرے صفحے کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر جدول کے مقصد کی توضیح کے لیے جو تفصیل پیش کرنا ہے وہ چند سطروں میں خود جدول کے اوپر نہ آسکتی ہو، بلکہ وہ علیحدہ صفحات پر تحریر ہو، تو جدول پر ایسی سرخی قائم کردینا چاہیے جس سے پتہ چل جائے کہ یہ جدول کس بات کی توضیح کے لیے ہے۔

کبھی اعداد وشمار اس طرح واضح کرنے کے لیے، کہ پوری تصویر ایک ہی نظر میں سامنے آجائے، میزانیات کا تقابلی خاکہ کھینچا جاتا ہے۔ لیکن اس خاکے میں ذرا سی بھی غلطی بڑی غلط فہمی کا سبب ہوسکتی ہے۔ لہذا بہتر ہے کہ خاکہ کو پہلے پنسل سے درست کرلے اور جب اس کی درستگی پر مکمل اطمینان ہو جائے تو پنسل کے خطوط پر قلم سے روشنائی پھیری جائے میزانیات کے تقابلی خاکے مثال حسب ذیل ہے۔

ہند کا تجارتی توازن

جنتا حکومت آنے کے بعد سے تجارتی توازن ہندوستان کے حق میں اچھا کہ ذیل کے تقابلی خاکے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۷۸-۱۹۷۷ء کے صرف ماہ اپریل سے دسمبر تک کا تجارتی توازن پیش کیا گیا ہے۔
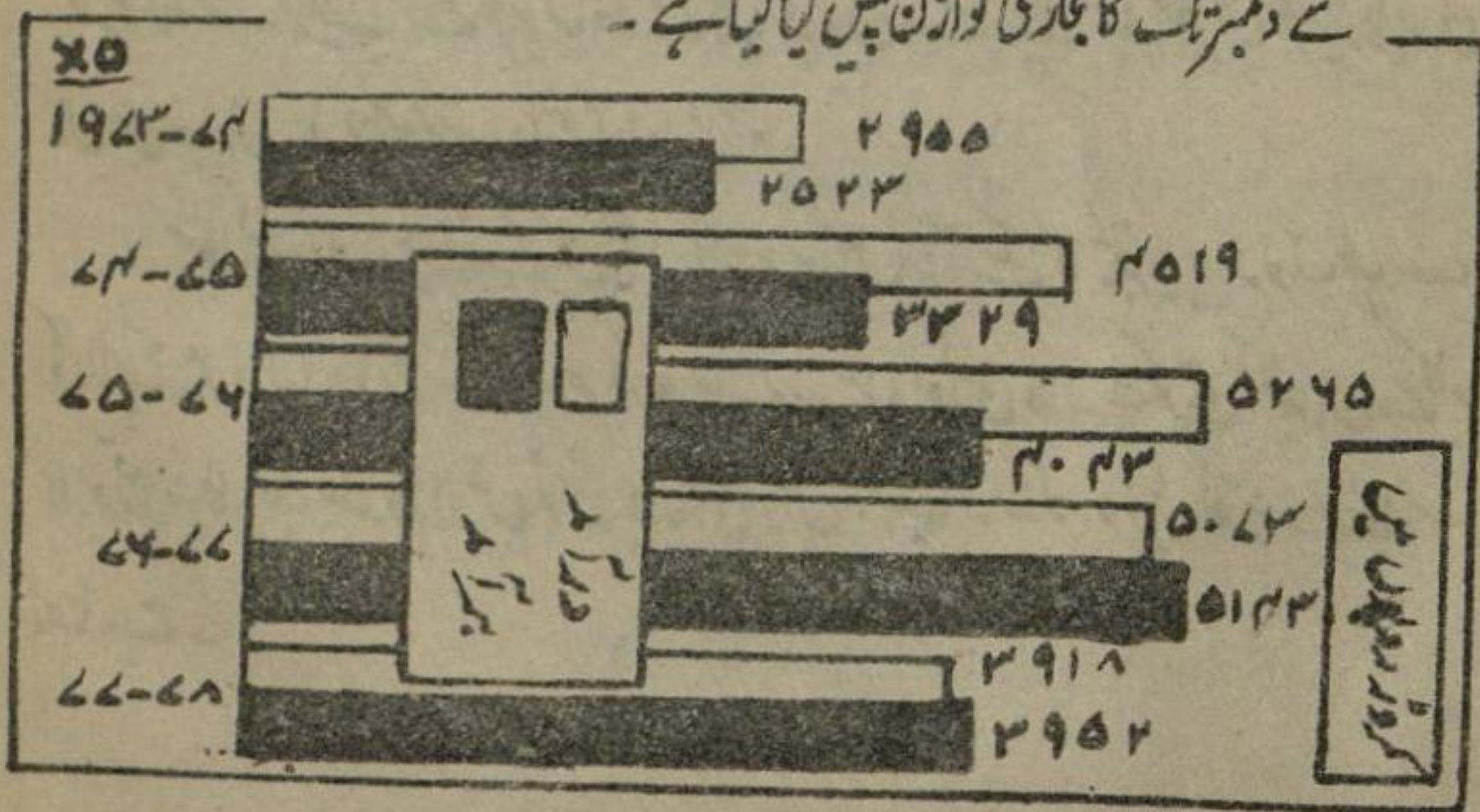
تصاویر:- اکثر اسکالر یہ چاہتے ہیں کہ تھیسس میں بیان کی ہوئی بعض باتوں کی توضیح فوٹو سے کی جائے۔ ان فوٹوؤں کو اس طرح صاف اور واضح ہونا چاہیے کہ بیان کردہ مطلب ان سے پوری طرح سمجھ میں آجائے، فوٹو مستقل صفحے پر ہو۔ اور تھیسس میں فوٹو کے نمبر کی طرف اشارہ، اور فوٹو پر ایسا عنوان ہو جس سے واضح ہو جائے کہ اس کا تعلق تھیسس کے کس حصہ سے ہے۔ فوٹو کو مربعات الارکان (کارنرس) کے ذریعے تھیسس کے صفحے کی لمبائی چوڑائی میں، جیسا مناسب ہو منسلک کر دیا جائے لیکن اس طرح کہ اُس کے اوپر صفحے میں اتنی گنجائش ہو کہ نمبر شمار اور عنوان درج کیا جا سکے۔ تھیسس کے حسن کو بڑھانے کے لیے اور اس خیال سے کہ فوٹو اپنے پہلے والے صفحے سے چپک نہ جائے، اس پر ایسا ہلکا اور نازک کاغذ لگا دینا مناسب ہے جس سے تصویر نمایاں رہے۔ اگر تحقیقی رسالے کا تعلق علوم طبعیہ یا علم ریاضی سے ہو تو اس میں لازماً خاکوں، نقشوں، میزانیات، اور ریاضی کے اشکال کی کثرت ہوگی لیکن ایسے ہی خریطوں وغیرہ کو شامل کرنا چاہیے جو بہت ضروری ہوں اور جن کا اس رسالہ سے بہت گہرا تعلق ہو۔ اور یہ ایسے واضح ہوں کہ الگ سے توضیح کی حاجت نہ ہو۔ اگر تھیسس کا تعلق اجتماعی علوم سے ہے تو اس میں نقشوں وغیرہ کے متعلق جدولیں زیادہ ہوں گی۔ ان جدولوں کو بھی اعداد و شمار کے لحاظ سے بالکل درست اور اتنا واضح اور مناسب مقام پر ہونا چاہیے کہ مطلب بسہولت سمجھ میں آجائے اور تھیسس کے تسلسل میں بھی فرق نہ آئے۔

جب نقشے اور تصویریں وغیرہ زیادہ ہوتی ہیں تو بعض اسکالر ان کو تھیسس کے آخر میں ایک جگہ پیش کر دیتے ہیں، لیکن یہ صورت بہتر نہیں ہے۔ ہر نقشے یا جدول کو دیکھنے کے لیے، برابر اوراق پلٹنا پڑیں گے اس سے بہتر ہے کہ ان کو ایک الگ جلد میں جمع کر دیا جائے۔ تاکہ یہ جس نکتے سے متعلق ہوں اس کو پڑھتے وقت متعلقہ جدول یا نقشہ نکال لیا جائے اور دونوں پر ایک ساتھ نظر پڑ جائے۔ اس صورت میں جدولوں اور خریطوں کا

ترتیب وہی ہونا چاہیے۔ جس ترتیب سے کتاب میں متعلقہ مواد ہو۔
انداز کتابت (جلی اور خفی قلم) مقیس اگر مطبوعہ ہو یا ہاتھ کی تحریر ہو، تو قلم کے جلی اور خفی ہونے کے لحاظ سے حسب ذیل باتیں پیش نظر رکھی جائیں گی۔

(۱) مقیس کا عنوان زیادہ موٹے قلم سے ہوگا، مصادر، عناوین کتاب، اور تصاویر کی فہرستیں، اصل عبارت سے جلی لیکن عنوان کے مقابلے میں خفی قلم سے ہوں گی۔

(۲) اصل رسالے کی عبارت عام معیار پر ہو، نہ بہت خفی نہ بہت جلی اگر رسالہ مطبوعہ ہے تو حاشیے کی عبارت اصل مقیس کے مقابلے میں زیادہ خفی، ملحقات اور ضمائم کا قلم بھی حاشیے کے قلم سے ملتا جلتا ہوگا۔

اگر رسالہ قلم سے لکھا گیا ہو تو حاشیہ وغیرہ بھی اسی قلم سے ہوگا جس سے اصل عبارت ہے، اگر رسالہ ٹائپ کیا گیا ہو، تو ہر فصل کی سرخی کے نیچے ایک خط کھینچ دیا جائے گا۔ اور سرخی کے حروف کو ذرا پھیلا کر لکھا جائے گا۔

عنوان اور اس کے نیچے جو عبارت تحریر ہو اس میں عام فاصلوں کے مقابلہ میں ڈیوڑھا فاصلہ ہوگا۔ حاشیہ کی سطروں کا فاصلہ مقیس کے مقابلہ میں کم ہوگا۔

اگر اثنائے تحریر میں کوئی ایسا جملہ آجائے جو خاص توجہ کا مستحق ہو تو مطالعہ کرنے والے کی توجہ مبذول کرنے کے لیے چند طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

(۱) انداز تحریر کی تبدیلی۔

(۲) کتابت کی نوعیت کا بدل دینا۔ مثلاً اہم کلمے یا جملے کو خطِ ثلث یا خطِ رقعہ میں لکھنا۔

(۳) عام قاعدہ جو زیادہ مروج ہے۔ اور جو قلمی و مطبوعہ اور ٹائپ سب میں چل سکتا ہے کہ، اہم کلمے یا جملے کے نیچے ایک سیدھی لکیر کھینچ دی جائے۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں نیچے خط کھینچا جائے گا۔

(۱) کتابوں، رسالوں یا مجلدات کے نام، اگر تھیسس کی عبارت میں آئیں تو ان کے نیچے خط کھینچا جائے گا لیکن حاشیے یا فہرست آخذ میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) اس کلمے یا جملے کے نیچے خط کھینچا جائے گا جس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا ہو (جیسا کہ بیان ہوا) لیکن اس طرح کے خطوط کم سے کم ہونا چاہیئے تاکہ ان کی اہمیت باقی رہے۔

(۳) دوسری زبانوں کی وہ لفظیں جو مروج نہ ہوں۔ جب لکھی جائیں گی تو ان کے نیچے بھی خط کھینچا جائے گا جیسے "فیکلٹی" وغیرہ۔ لیکن اگر یہ لفظیں مروج ہو کر جزء زبان بن گئی ہوں، جیسے "پروفیسر" یا "ڈاکٹر" تو خط کھینچے کی ضرورت نہیں۔

چوتھا باب
تھیس کی ماہیت

تھیسس کا حجم:۔ حجم کے سلسلے میں کوئی معین قاعدہ نہیں ہے، کیوں کہ موضوع کے لحاظ سے حجم میں کمی اور زیادتی ممکن ہے اگر تھیسس کا تعلق، سائنس یا ریاضی کے کسی مسئلہ سے ہے تو اس کا حجم زیادہ نہیں ہوگا۔

بنیادی بات یہ ہے، کہ مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہو گئے ہوں، بحث کے تمام عناصر، دلیلیں اور نتائج روشن ہو گئے ہوں اور حجم اتنا کم نہ ہو کہ رسالے کے بجائے مضمون کہا جائے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، علمی مضمون اور تھیسس میں حجم ہی کی بنا پر فرق کیا جاتا ہے بعض وہ ٹھوس مضامین، جو علمی رسالوں میں چھپتے ہیں بہت نتیجہ خیز، معلومات افزا، محققین کے لیے مواد فراہم کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مضمون کتنے صفحے کا ہے۔ لیکن تھیسس میں حجم کا لحاظ کیا جاتا ہے، اتنا حجم ضرور ہونا چاہیے کہ کتاب کہی جا سکے۔

ٹائیٹل پیج:۔ تھیسس کا سب سے پہلا ورق "ٹائیٹل پیج" ہوتا ہے، جلد بندی کے وقت "ٹائیٹل پیج" سے قبل ایک سادہ ورق لگا دینا مناسب ہے۔ ٹائیٹل پر حسب ذیل باتیں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) تھیسس کا عنوان۔

(۲) پیش کرنے والے کا نام

(۳) کس ڈگری کے لیے پیش کی۔

(۴) یونیورسٹی کا نام جس سے ڈگری حاصل کرنا ہے اور اس شعبہ کی تصریح جس کے لیے تھیسس پیش کی گئی۔

ٹائیٹل پر مذکورۂ بالا باتیں مناسب طریقے پر درج ہونا چاہیے۔

اظہارِ تشکر:۔ تحقیق کے دوران بہت سے اشخاص اور اداروں سے مدد حاصل

کرنا پڑتی ہے، دوسروں کے تعاون ہی سے تحقیق منزل بمنزل ہوتی ہوئی اختتام تک پہونچتی ہے۔

انسانیت، اور اخلاق کا تقاضہ ہے کہ جن کی مدد سے تھیسس مکمل ہوتی ہے ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اظہار تشکر ٹائٹل پیج کے بعد ہی کے صفحہ پر رسالہ کے بالکل ابتدا میں ہونا چاہیے۔ اس کی سرخی "اظہار تشکر" "سپاس گذاری" "اعترافِ تعاون" وغیرہ قرار دی جا سکتی ہے۔ سرخی کے بعد سب سے پہلے اس کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے موضوع پر ریسرچ کا موقع دیا۔ پھر اپنے سپروائزر کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جس نے تھیسس کی نگرانی کی، بحث کی راہیں متعین کرنے میں مدد کرتا رہا۔ اس کے بعد دیگر اساتذہ اور اہلِ علم، جنھوں نے تحقیق کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔ ایسے افراد جنھوں نے مخطوطات اور نادر کتابیں عاریت دیں یا ان کے مطالعہ کی اجازت دی، کتب خانوں کے لابریرینس جنھوں نے آسانیاں مہیا کیں سب کا مختصر مختصر الفاظ میں شکریہ ادا کیا جائے گا تعریف و توصیف میں مبالغہ تحقیقی رسالہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔

مضامین کی فہرست :- فہرست نگاری کا انداز حسب ذیل ہوتا ہے۔

(الف) مقدمہ مقدمہ ذرا نمایاں خط سے لکھنے کے بعد آخر صفحہ تک نقطے دے کر آخر میں حروف ابجد کے لحاظ سے، جس حرف سے مقدمہ شروع ہو رہا ہے۔ اس کو لکھے۔ ڈیش دے کر جس حرف پر مقدمہ ختم ہو، وہ لکھا جائے۔ نمونہ درج ذیل ہے :-

(۱) مقدمہ - - - - - - - - - - - - - - - - - - ج ــ ز

(ب) فہرست مضامین :- مضامین کی فہرست لکھنے میں پوری توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ حسب ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

پہلا باب یا دوسرا باب، جو کچھ بھی ہو وہ وسط صفحہ میں بطور عنوان لکھا جائے۔ اس

کے بعد ابتدائی سطر میں باب کی عمومی سرخی لکھ نقطے دے کر باقی سطر کے آخر میں جس صفحے سے باب کی ابتدا ہو رہی ہو اس کا نمبر مع ڈیش دے کر، جس پر اختتام ہو رہا ہو اس کا نمبر دیا جائے۔ باب کے عنوان کے بعد تقریباً دوگنا فاصلہ دے کر، اسکے ماتحت جو ضمنی فصول آ رہی ہیں انکی فہرست دی جائے گی ہر ضمنی فصلوں کے عنوان کے سامنے صرف ابتدائی صفحے کا نمبر لکھنا کافی ہے۔ اختتام کے نمبر کی ضرورت نہیں ہے پہلے باب کے تمام فصول کے عنوانات ختم ہو جانے کے بعد عام سطروں کے مقابلہ میں دوگنا فاصلہ چھوڑ کر پھر وسط صفحہ میں باب ثانی لکھا جائے گا۔ اور مثل سابق ضمنی فصلوں کی ترتیب قائم کی جائے گی۔

(ج) رسالے کے اصل مضامین کی فہرست ختم ہونے کے بعد جدولوں، نقشوں، خاکوں تصاویر و ملحقات وثائق کی فہرست آئے گی۔ جس میں جدول یا تصویر کا نمبر متعلقہ توضیح اور صفحے کا نمبر ہوگا۔

مقدمہ:۔ فہرست کے بعد والے صفحے سے مقدمہ شروع کیا جائے گا۔ حسب ذیل باتیں مقدمہ کے بنیادی عناصر میں شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) موضوع کے سلسلہ میں کیا الجھن پائی جاتی ہیں۔ ان کا علمی معیار اور معاشرہ میں ان کی اہمیت کیا ہے۔

(۲) موضوع سے تاریخی بحث، یہ الجھن کب پیدا ہوئی۔ ان میں مختلف ادوار میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ کن گوشوں سے آئیں۔ کن لوگوں سے ان سے بحث کی، سابق محققین کی بحث کس حد تک پہونچی اور ان سے کیا نتائج مرتب ہوئے، کون سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ اس طرح تھیسس پڑھنے سے قبل ہی مطالعہ کرنے والے کی نظر میں موضوع کی موجودہ حالت اور تھیسس سے قبل کی مکمل تصویر آجائے گی۔ اسے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ تھیسس نے بحث کو کتنا آگے بڑھایا اور کیا علمی فوائد حاصل ہوئے۔ اسکالر کی محنت اور تھیسس کی قدر و قیمت پر روشنی پڑجائے گی۔

(۳) ان بنیادی مصادر کا تذکرہ جن سے اسکالر نے فائدہ حاصل کیا ہے۔ مخصوص وثائق یا مخطوطات سے کیا نیا مواد حاصل ہوا، اس سے موضوع پر کیا روشنی پڑی اور کیا علمی فوائد حاصل ہوئے۔ اس ضمن میں بہتر ہے کہ تمام مآخذ کا الگ الگ فن وار تقسیم کر کے ذکر کیا جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ کس فن کے مآخذ سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

مقدمے کی تکمیل کے بعد اصل رسالہ شروع ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے صفحے پر رسالے کا عنوان اور موضوع وسط میں لکھ کر ورق کو سادہ چھوڑ دیا جائے۔ اور ہر باب کی ابتدا کرتے وقت پہلے صفحے پر وسط میں باب کا نمبر یعنی پہلا یا دوسرا باب۔ اور اس کے تقریباً دو سنٹی میٹر بعد باب کا عنوان لکھ کر سادا چھوڑ دیا جائے، اور دوسرے ورق سے مضمون کی ابتدا کی جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسالہ کے اندر باب خود اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے۔ اور موضوع کا کوئی ضمنی نقطہ اپنے مالہ، وما علیہ کے ساتھ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ باب کے ماتحت جو ضمنی بحثیں آتی ہیں، اگر وہ طولانی ہوں، تو بہتر ہے کہ ہر ایک کو نئے صفحے سے شروع کیا جائے، اور ابتدائے صفحہ کے وسط میں بحث کا عنوان لکھ دیا جائے۔ لیکن اگر سب یا اکثر ضمنی بحثیں مختصر ہوں۔ تو نئے صفحے سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پہلی بحث کے اختتام اور دوسری بحث کے شروع میں تقریباً دو سنٹی میٹر کا فاصلہ چھوڑ کر بجائے وسط کے بحث کا عنوان پہلو میں لکھا جائے اور عنوان کے بعد تلے اوپر دو نقطے دے دیے جائیں۔

بعض رسالے کسی موضوع کے متعلق مخصوص نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ اس صورت میں آخر رسالہ میں اہم نتائج، خلاصۂ بحث وغیرہ کی سرخی سے ان خاص نتائج کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو لکھتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا

جائے کہ نتائج واضح اور مکمل طور پر مطالعہ کرنے والے کے ذہن نشین ہو جائیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص صرف یہ دیکھنا چاہے کہ کیا نئی باتیں کہی گئی ہیں اور کیا نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اگر رسالے کا یہ حصہ مجمل ہوا اور پوری توجہ جذب کر سکا، تو رسالے کی پوری اہمیت اور قدر و قیمت واضح نہ ہو گی اور جو علمی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، وہ حاصل نہ ہوں گے۔

خلاصۂ بحث کے بعد معذرت یا اس سے ملتے جلتے عنوان کے تحت یہ بیان کرنا چاہیے کہ کون سے گوشے ابھی تشنہ رہ گئے اور وقت یا ضروری سرمایہ کی کمی یا ماخذ پر دسترس نہ ہونے کی بنا پر ان کو پوری طرح منقح نہیں کیا جا سکا۔

وثائق اور ضمیمے :۔ تھیسس ختم کرنے کے بعد ملحقات وثائق منسلک کیے جائیں گے۔

وثائق :۔ مختصر تشریح گذر چکی۔

ضمیمے :۔ ضمن بحث میں کچھ ایسی باتیں آجاتی ہیں۔ جو اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان کا موضوع سے زیادہ ربط نہیں ہوتا۔ لہذا تسلسل کو قائم رکھنے اور طول کلام سے بچنے کے لیے۔ مناسب نہیں ہوتا کہ ان کو تھیسس کے ضمن میں بیان کیا جائے۔ اگر مختصر ہوں تو ان کو حاشیے میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اگر طولانی ہوں تو تھیسس کے ختم ہونے کے بعد ملحقات یا ضمیمے کی سرخی سے تھیسس سے منسلک کر دینا چاہیے۔

ضمیموں اور وثائق کا محل :۔ بعض علما ضمیموں اور وثائق کی جگہ مصادر کی فہرست کے بعد قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ان میں موضوع سے مرتبط بات اصل رسالہ میں آ چکی اب پوری تفصیل زائد اور غیر متعلق سی چیز ہے۔ اور مصادر کو اصل موضوع سے بہت زیادہ ربط ہے کیونکہ تھیسس کی اہمیت انھیں پر موقوف ہے۔ لہذا مآخذ و مصادر کو مقدم ہونا چاہیے۔ بعد میں مزید فائدے کے لیے ملحقات وثائق کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ دیگر علما کے نزدیک، جن میں احمد شلبی، مصنف رسالہ "کیف تکتب بحثاً" بھی شامل ہیں۔

چوں کہ ضمیموں اور وثائق کو رسالہ سے علمی رابطہ ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ مصادر میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہوں جن سے ان ضمیموں اور وثائق کو حاصل کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ ملحقات وثائق کو مصادر پر مقدم قرار دیتے ہیں۔

ضمیموں اور وثائق کی ترتیب نمبر شمار سے معین کر دینا چاہیئے۔ اور رسالہ میں جس جگہ ان کا تذکرہ آیا ہو، وہاں ان کا نمبر وار صفحہ درج کر دینا چاہیئے (مثلاً دیکھو وثیقہ نمبر ایک صفحہ ......)

مصادر و مآخذ :- کچھ مقامات پر مروج ہے کہ رسالہ کے آخر میں اسکالر اپنا تعارف کراتا ہے۔ کیا کیا ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کن کن علمی موضوعات پر کام کیا ہے، اور کون کون زبانیں جانتا ہے۔ لیکن بہت سی جگہوں پر، جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، یہ نہیں ہے، اور بظاہر مناسب بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ریسرچ اسکالر کا علمی مقام معین کرنے کے لیے خود اس کی کتاب ہی کافی ہے۔ لہٰذا تھیسس کے آخر میں یا تو ضمیمے یا وثائق آئیں گے یا مآخذ مصادر (ریسرچ اسکالر جو طریقہ کار پسند کرے۔)

بعض محققین کی رائے میں مصادر کی فہرست میں موضوع سے متعلق تمام وہ کتابیں آجاتی ہیں جن کا ریسرچ اسکالر نے مطالعہ کیا ہے، اور ان سے موضوع کے متعلقہ مسائل کو سمجھنے میں مدد لی ہے۔ چاہے ان کا اقتباس ہو یا نہ ہو۔ لیکن دیگر علماء کے نزدیک ایسی کتابوں کا ذکر جن سے موضوع کو سمجھنے میں فائدہ ہوا ہو، مگر ان کا کوئی اقتباس نہ ہو، مقدمے میں ہونا چاہیئے۔ فہرست مصادر میں صرف وہی کتابیں آئیں گی جن کا حاشیہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ کیونکہ انھیں کتابوں کا رسالہ کی تدوین میں حصہ ہے احمد شبلی کی رائے میں فہرست مصادر کے ضمن میں ان ہی کتابوں کو بیان کرنا چاہیئے۔ جن کا تھیسس کی تدوین و تکمیل میں حصہ ہو۔ جن کتابوں کا ضمناً ذکر آ گیا ہو اور ان کا تعلق تھیسس کے موضوع سے نہ ہو ان کا ذکر صرف حاشیے میں کافی ہے۔ احمد شبلی نے

مذکورہ بالا بنیاد پر چار قسمیں قرار دی ہیں۔

(۱) وہ کتابیں جن کا تذکرہ مقدمے حاشیے اور فہرست مصادر سب میں ہوگا۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا تھیسس سے خصوصی ربط ہو۔ اس کی تکمیل میں نمایاں حصہ ہو، اور اس سے مضامین بھی اخذ کیے گئے ہوں۔

(۲) وہ کتابیں جن سے تھیسس کے مواد میں خصوصی استفادہ کیا گیا ہو۔ لیکن موضوع سے بنیادی تعلق نہ ہو۔ ان کا ذکر فہرست مآخذ اور حاشیے میں کیا جائے گا۔ مقدمہ میں تذکرے کی ضرورت نہیں۔

(۳) وہ کتابیں جن سے ریسرچ اسکالر نے عمومی فائدہ حاصل کیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے تنقیح موضوع میں مدد لی ہے ان کا تذکرہ صرف مقدمے میں کیا جائے گا۔ (حاشیے اور فہرست مصادر میں اس لیے ذکر نہیں آئے گا کیونکہ ان کا اقتباس نہیں ہے۔)

(۴) وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ تھیسس میں ضمناً آگیا ہے۔ رسالے کی تدوین میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یعنی اگر ان کا کوئی ذکر نہ ہوتا تو رسالہ میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ ان کا صرف حاشیہ میں ذکر کافی ہے۔

میرے خیال میں تمام ان اہم کتابوں کا جو موضوع سے مرتبط ہیں چاہے ان کے مطالعے سے ریسرچ اسکالر نے صرف عمومی فائدہ حاصل کیا ہو، اور موضوع کی تحقیق و تنقیح میں مدد لی ہو۔ اگرچہ کوئی اقتباس نہ بھی ہو۔ مقدمہ اور فہرست مآخذ دونوں میں ذکر کیا جائے کیوں کہ ممکن ہے۔ موضوع کے متعلق ریسرچ کرنے والے دوسرے اسکالر صرف فہرست مآخذ پر نظر ڈالیں۔ تاکہ موضوع کے متعلق بنیادی کتابیں سامنے آجائیں۔ تو اگر فہرست میں ان اہم کتابوں کا ذکر نہ ہوا تو یہ کتابیں ان کی نظر سے اوجھل رہیں گی۔ اور ان سے جو ممکن فائدہ دوسرے محققین حاصل کر سکتے تھے، اس سے وہ محروم رہیں گے۔

عام طور سے مصادر کا ذکر تھیسس کے آخر میں کیا جاتا ہے لیکن بعض اسکالر ہر باب کے مصادر کا ذکر اس کے اختتام پر کر دیتے ہیں۔ اور تھیسس کے بعد ان عمومی مآخذ کا ذکر کرتے ہیں جن سے زیادہ تر ابواب میں فائدہ حاصل کیا ہے۔ یہ صورت بھی بری نہیں ہے بشرطیکہ ایسے مآخذ ہوں، جن سے صرف مخصوص ابواب کو فائدہ پہونچا ہو اور دوسرے ابواب سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

فہرست مصادر میں مذکورہ ذیل ترتیب مناسب ہے۔

(۱) سب سے پہلے مخطوطات کی فہرست۔ جن کی ترتیب مصنفین کے مشہور ناموں کے حروف تہجی کے لحاظ سے قائم کی جائے گی۔ عربی اسماء میں ناموں سے پہلے جو ملحقات ہوتے ہیں جیسے ابو، ابن، ال وغیرہ ان کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً ابوالعباس کا ذکر الف کے ضمن میں نہیں بلکہ "عباس" کے لحاظ سے "عین" کے ضمن میں ہوگا۔ لیکن چونکہ ہندوستانی ناموں میں، یہ ملحقات نہیں بلکہ جزو اسم ہوتے ہیں لہذا ابوالحسن، ابن علی، اگر عربی اسماء ہوں تو ح، اور ع کے ضمن میں، لیکن اگر ہندوستانی نام ہوں، تو سب کا ذکر الف کے ذیل میں کیا جائے گا۔

مشہور نام تحریر کرنے کے بعد تلے اوپر دو نقطے دے کر پورا نام پھر قوسین کے اندر تاریخ وفات (اگر وفات پا چکا ہو) اور اگر تاریخ وفات معلوم نہ ہو۔ تو تقریبی سنہ وفات، پھر مخطوطے کا عنوان، متہ؛ اور اگر لائبریری میں ہے تو نمبر لکھا جائے گا۔ مثلاً عینی:۔ بدرالدین محمد بن احمد (۸۵۵ھ) عقدالجمان فی التاریخ الزمان۔ مخطوط، دارالکتب مصریہ؛ نمبر ۸۲۳ ح۔

(۲) مخطوطات کے بعد ان مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہوگی، جن کا تھیسس سے خصوصی تعلق ہو۔ مثلاً عربوں کی تاریخ یا ادب وغیرہ سے تھیسس متعلق ہے۔ تو عربی مطبوعات کا ذکر پہلے آئے گا اور اگر موضوع کا بنیادی مواد اردو میں بھی ملتا ہے، تو اردو کے

مطبوعہ کتب کی فہرست دوسرے نمبر پر قرار دی جائے گی۔ مطبوعات کی تفصیل بھی اسی انداز پر ہوگی جو مخطوطات میں ہے۔ صرف فرق اتنا ہوگا کہ پتہ کے بجائے مطبع کا نام اور سنہ طباعت درج کیا جائے گا۔ مشاہیر اہل علم کا پہلے وہ نام لکھا جائے گا جس سے مشہور ہیں۔ پھر دو نقطے دے کر ان کے مخصوص القاب ذکر کیے جائیں گے۔

اگر کتاب کی طباعت کئی مرتبہ ہوئی ہو۔ تو یہ بھی معین کرنا چاہیے کہ کون سی طباعت ریسرچ اسکالر کے زیر مطالعہ تھی۔

(۳) اگر غیر زبانوں کے مصادر (یعنی اردو اور عربی وغیرہ کے علاوہ) سے بھی استفادہ کیا گیا ہو تو ان کی فہرست میں بھی تمام مذکورہ بالا تفاصیل کا بھی خیال رکھا جائے گا صرف اتنا فرق رہے کہ مصنفین کے نام کے آخری لفظ (The sirname) کے لحاظ سے فہرست بنائی جائے گی۔

(۴) وہ کتابیں جن کے مصنفین و مولفین کا علم نہ ہو سکے، ضمیمے اور وثائق عدالتی فیصلے، دوائر المعارف، رسالے و جرائد، ان سب چیزوں کا ذکر اس ترتیب سے کیا جائے گا۔ جس لحاظ سے تھیسس میں آتے ہوں۔ اگر ایک مجلّے کے کئی مقالوں سے استنباط کیا گیا ہو اس مجلّے کے ذیل میں نمبر (۱ - ۲ - ۳) ڈال کر ہر نمبر کے بعد مقالے کا عنوان، مصنف کا نام، جس صفحے سے مقالہ کی ابتدا ہوئی ہو، سب ترتیب وار لکھا جائے گا۔

مذکورہ بالا طریقے پر ہر قسم کی ماخذ کی فہرست لکھنے کی اس وقت ضرورت ہوگی، جب ہر قسم کے ماخذوں کی کثرت ہو لیکن اگر ماخذ کم ہوں ہو تو علیحدہ علیحدہ تقسیم کی ضرورت نہیں۔ بلکہ حروف تہجی کی ترتیب سے سب کو ایک ہی ذیل میں لکھنا کافی ہے۔

اگر مصادر زیادہ ہیں تو ان کا نمبر شمار دینے میں یہ بھی ممکن ہے کہ تمام مصادر کے نمبر شمار ایک سلسلے سے لکھے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر قسم کے مصادر کے نمبر شمار بھی علیحدہ قرار دیئے جائیں۔ مذکورہ بالا چار قسموں میں سے اگر کسی قسم کے مصادر موجود نہ

ہوں تو اس کو حذف کر دیا جائے گا۔ مثلاً اگر مخطوطات سے فائدہ حاصل نہیں کیا گیا ہے تو صرف بقیہ تینوں قسم کا ذکر کیا جائے گا۔ مصادر کی فہرست میں اُن کتابوں کو ہرگز ذکر نہ کرنا چاہیے، جن کا اسکالر نے خود مطالعہ نہ کیا ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تمام اہم مراجع پر ریسرچ اسکالر نے اجمالی نظر ڈال لی ہو۔ اور عمومی حیثیت سے اس کے مضامین۔ انداز تحریر مولف کے میلانات، اس کے زمانے، اور کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو کیونکہ دالیوا میں اکثر یہ باتیں زیر بحث آجاتی ہیں۔

پانچواں باب

کتابت و جلد بندی

یورپ میں اکثر ریسرچ اسکالر ٹائپ کرنا جانتے ہیں، اور ان کے پاس یا تو ذاتی ٹائپ رائٹر ہوتے ہیں، یا اپنے ساتھیوں سے عاریتاً حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اگر ریسرچ اسکالر ٹائپ کرنے سے واقف ہو۔ اور اس کے پاس ذاتی ٹائپ رائٹر ہو یا عاریتاً لے ہو سکتا ہو۔ تو خود ٹائپ کرنے سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کیوں کہ وہ خود قواعد و ضوابط کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی تھیسس کو بہتر سے بہتر شکل میں پیش کر سکتا ہے لیکن چونکہ یہاں عام طور پر یہ صورت ممکن نہیں، لہٰذا دوسروں ہی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ مگر یہ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ٹائپ کی جو بھی غلطیاں ہیں ان کا ذمہ دار ریسرچ اسکالر ہی قرار پائے گا، چاہے وہ ٹائپسٹ ہی کی غلطیاں کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ٹائپ کرنے کے لیے ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو اپنے فن میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ مسودے کو بالکل صحیح ترتیب اور پورے قواعد و ضوابط کا لحاظ رکھتے ہوئے درست صورت میں مرتب کر کے ٹائپسٹ کو دے۔ اور اس کو اچھی طرح سمجھا دے کہ حاشیہ کتنا چھوڑا جائے گا۔ سطروں میں کتنا فاصلہ ہوگا۔ تھیسس کی عبارت کے ذیل میں کوئی نمبر آئے تو کیسے دیا جائے گا۔ اور حاشیہ پر نمبر آئے تو کیسے دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ٹائپ کرنے والا کتنا ہی ماہر ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ غلطیاں تو رہ ہی جاتی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ریسرچ اسکالر اس سلسلہ میں بھی اپنا وقت صرف کرے، مسودہ سے ٹائپ کے لیے خود بولتا جائے۔ ٹائپ پر بھی ایک نظر رکھے اور جہاں پر بھی غلطی ہو وہیں تصحیح کر دا دے۔ ہر ورق کو ٹائپ ہونے کے بعد اصل سے مطابق کرے۔ اور اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو ان کو ٹائپ ہی سے درست کرائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو روشنائی اصل مسودہ سے مطابقت کرائے اور ربنے نیچے والی کاپی پر پنسل سے تصحیح کرتا جائے، اور دیگر کاپیوں کی تصحیح ٹائپ ہی سے کروائے۔ بعض لوگ تمام کاپیوں پر خود ہی تصحیح کر لیتے ہیں لیکن اگر ممکن ہو تو پہلی صورت بہتر ہے۔ اگر کسی صفحے پر بہت زیادہ غلطیاں ہو جائیں تو زیادہ کاٹ پیٹ اور تصحیح کے مقابلے

میں بہتر ہے کہ اس صفحے کو دوبارہ ٹائپ کردا لیا جائے۔ تھیسس کی خوشنمائی ان بنیادی باتوں میں سے ہے جن کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیئے۔ کاٹ چھانٹ اور تصحیح ایسی ہو جو نمایاں طور پر محسوس ہو اور صفحے کو بدنما بنا دے۔

کتابت صرف ایک صفحے پر ہو اور دوسرا صفحہ سادا ہو۔ عبارت کو ایک سطر کا فاصلہ چھوڑ کر لکھا جائے، تاکہ تحریر واضح رہے اور پڑھنے میں آسانی ہو۔ اس طرح یہ بھی گنجائش رہے گی کہ اگر کسی کلمے یا جملے کا اضافہ یا تبدیلی کرنا ہو تو اس کو بین السطور میں لکھا جا سکے گا۔

ٹائپ کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ بالکل مسودے کے مطابق ٹائپ کرے۔ لہذا ریسرچ اسکالر کو مسودہ بالکل ویسا ہی لکھنا چاہیئے جیسا ٹائپ شدہ دیکھنا چاہتا ہے۔ مسودہ اکا ماز اور فل سٹاپس وغیرہ کے لحاظ سے بالکل درست ہو۔ جہاں اشارے لکھنا ہوں وہاں اشارے (مثلاً صلی اللہ علیہ وآلہ کے بجائے ؐ) اور جہاں مکمل لفظ یا جملہ چاہتا ہو وہاں مسودہ میں بھی کامل لکھے۔

کتابت کی دقتیں اور ان کا حل: ہندوستان میں اردو یا عربی رسائل کو ٹائپ کرانے میں اکثر زحمت پیش آتی رہتی ہے۔ کیونکہ نستعلیق کے ٹائپ رائٹر تو ملتے ہی نہیں۔۔ نسخ کے ٹائپ رائٹر اور ان میں مہارت رکھنے والے بھی کم ہیں۔ لہذا اکثر ریسرچ اسکالر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا پڑتا ہے یا کاتب سے لکھوانا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے، کہ کتابت کے لیے اس شخص کو منتخب کیا جائے تو غلط نویس نہ ہو۔ چونکہ اردو کتابوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ آنا ضروری ہیں۔ لہذا کاتب ایسا ہونا چاہیے جو تھوڑی بہت عربی اور فارسی یا کم از کم فارسی کا سواد رکھتا ہو جتنے اوراق لکھوانا ہوں انھیں بال پن یا کلپ سے کاربن پیپر سے منسلک کر لیا جائے تاکہ حروف اور سطریں برابر آئیں۔ کاربن پیپر زیادہ استعمال شدہ نہ ہوں، تاکہ عبارت صاف اور واضح ہو۔ کاتب کی

کتابت کے وقت نگرانی کرتا رہے، کہ زیادہ غلطیاں نہ ہوں اور جو غلطیاں ہو جائیں ان کی فوراً تصحیح کرادے تاکہ کاتب متوجہ رہے اور ویسی غلطی پھر نہ کرے۔

ہندوستان میں اردو، عربی یا فارسی پر کام کرنے والوں کے لیے تھیسس کے لکھوانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹائپ رائٹر اور کاتب کم یاب، کاتب مل بھی جائیں تو اجرت زیادہ مانگتے ہیں اور کام دیر میں کرتے ہیں۔ تصحیح وغیرہ میں توجہ سے کام نہیں لیتے۔ تھیسس کو تیار کرنے اور لکھوانے میں اسکالر کو بڑے ہفت خوان طے کرنا پڑتے ہیں، لہذا میرے خیال میں جن شعبوں میں اس طرح کی تحقیق ہوتی ہے ان کے لیے یونی ورسٹی کی طرف سے ٹائپ رائٹر اور ماہر ٹائپسٹ کا انتظام ہونا چاہیے، جو مناسب اجرت پر تھیسس کی کتابت کی ذمہ داری لیں۔

اس سے اولاً تو ریسرچ اسکالر دربدری اور دوسری سے بچ جائے گا۔ دوسرے مسلسل تھیسس ہی ٹائپ کرنے کی بنا پر، یہ لوگ تھیسس کے انداز کتابت اور قواعد و ضوابط سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے، ان سے کم سے کم غلطیاں ہوں گی۔ اور کتابت جلد بہتر اور خوشنما انداز سے مکمل ہو جائے گی۔

کتنے نسخے ہونا چاہیئے: یونیورسٹیوں اور شعبوں کے لحاظ سے نسخوں کی تعداد بدلتی رہتی ہے۔ عموماً معیار یہ ہے کہ جتنے ممتحن ہوں اتنے نسخوں کے علاوہ کم از کم ایک نسخہ جو ریسرچ اسکالر کے پاس رہے۔ اور بہتر ہے کہ ایک احتیاطی نسخہ بھی کسی ناگہانی ضرورت کے لیے موجود رہے۔

ہندوستان میں عام طور پر تین یا چار نسخے پیش کیے جاتے ہیں۔ لہذا بہتر ہے کہ ان کے علاوہ دو نسخے اور ہوں، ایک احتیاطی اور ایک ریسرچ اسکالر کا ذاتی نسخہ۔

کاغذ، کاربن پیپر اور حاشیہ: تھیسس کے لیے سفید اور غیر مسطر تیلا کاغذ استعمال

کرنا چاہیے جس کا طول و عرض اگر تھیسس کا حجم زیادہ تو ۲۹ : ۲۲ سینٹی میٹر اور اگر حجم کم ہو تو ۲۶ ، ۲۰ سنٹی میٹر مناسب ہے۔ کاربن پیپر کے ذریعے سے ایک ہی دفعہ تمام نسخوں کی کتابت کی جاسکتی ہے کہ کاربن پیپر بہت اچھا ہونا چاہیئے۔ اور سات آٹھ مرتبہ استعمال کرنے کے بعد اس کو بدل دینا چاہیئے۔ اسی طرح ٹائپ رائٹر کا فیتہ بھی بہت زیادہ ہلکا نہ ہو، کہ حروف ہلکے ٹائپ ہوں۔ کاغذ اس لیے نازک ہو کہ مطلوبہ نسخوں پر حروف صحیح ابھریں۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ تھیسس کو اسٹینسل پر ٹائپ کروایا جائے۔ پھر سائیکلواسٹائل کے ذریعہ جتنے نسخے درکار ہوں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح تمام نسخے عمدگی اور وضاحت میں ایک جیسے ہوں گے۔

اگر تھیسس کی کتابت کی گئی ہو یا مطبوعہ ہو، تو حاشیہ دونوں پہلو سے چھوٹنا چاہیئے، داہنی طرف حاشیہ پانچ سنٹی میٹر کے قریب ہونا چاہیے۔ اوپر اور نیچے تین سنٹی میٹر چھوڑنا کافی ہے۔

صفحات کے نمبر: تشکر، اعتراف، فہرست اور مقدمے کے صفحات میں اعداد کے بجائے حروف تہجی کا استعمال کیا جاتا ہے (ا، ب، ج، د، وغیرہ) عنوان کے صفحے پر کوئی نمبر نہیں دیا جاتا ہے۔ لیکن شمار میں اس کو بھی شامل کیا جاتا ہے یعنی بعد والے صفحے پر بجائے "الف" کے "ب" تحریر کیا جائے گا۔

بعض اوقات تھیسس میں کچھ لوحیں ایسی شامل ہوتی ہیں جو اپنے طول کے لحاظ سے تھیسس کے کئی صفحوں کے برابر ہوتی ہیں۔ یہ لوحیں چاہے کتنی ہی طولانی ہو ان میں ہر ایک کا ایک ہی نمبر قرار دیا جائے گا۔

رسالوں میں صفحات کے نمبر اوپر اور نیچے دونوں طرف دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن صفحے کے بالائی حصے میں نمبر دینا بہتر ہے، ان کو قوسین میں لکھنا، یا ان کے بعد نقطے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر تھیسس کی مختلف فصلوں کی کئی آدمی کتابت کر رہے ہوں یا ٹائپ کر رہے ہوں، تو تھیسس کی تیاری کے بعد جلد بندی کے وقت نمبر دیئے جائیں گے۔ کبھی کبھی نمبر دینے کے بعد کچھ اوراق کے حذف یا اضافے کی ضرورت ہوتی ہے، تو اگر حذف کیے جائیں تو ان محذوف اوراق کے نمبر ان کے پہلے والے صفحے پر دے دیے جائیں گے۔ مثلاً صفحہ ۸۷ - ۸۸ حذف کیے جائیں تو صفحہ ۸۶ پر ہی ۸۷، ۸۸ کے نمبر دیئے جائیں گے۔ اگر کچھ ورق بڑھائے جائیں تو ان سے پہلے صفحے کا جو نمبر ہے وہی ان پر بھی دیا جائے گا، اور حسب ترتیب ہجی کے لحاظ سے ماقبل و مابعد کو معین کر دیا جائے گا۔ مثلاً ۸۶ صفحے کے بعد دو صفحوں کا اضافہ ہو تو پہلے صفحہ پر ۸۶ الف، بعد والے صفحے پر ۸۶ ب، اور تیسرے صفحے پر ۸۶ ج، لکھا جائے گا۔ اس طرح تسلسل قائم رہے گا اور کسی تغیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ ریسرچ اسکالر کے لیے ضروری ہے کہ جتنی بھی جلدیں داخل کرے وہ سب مجلد ہوں تاکہ اوراق اور ترتیب محفوظ رہے اور تھیسس شاندار معلوم ہو، جلد مضبوط ہو اور داہنی طرف جو پانچ سنٹی میٹر کا حاشیہ چھوڑا گیا ہے، اس کا نصف سے زیادہ دباؤ میں نہ آئے اور پڑھنے میں دقت نہ ہو۔

جلد ساز کو متوجہ کر دینا چاہیے کہ جو لوحیں اور نقشے وغیرہ زیادہ طویل و عریض ہونے کی بنا پر تہہ کر دیئے گئے ہیں، وہ جلد کے دباؤ میں نہ آ جائیں کہ اُن کو کھولنا ہی ممکن نہ رہے۔

اگر تھیسس کا حجم زیادہ ہو اور وہ اتنی دبیز ہو کہ اس کے پشتہ پر نام لکھا جا سکے۔ تو دمیں جلد کے غلاف پر نام لکھا جائے گا۔ ورنہ تھیسس کے بالائی حصہ غلاف پر نام وغیرہ تحریر کیا جائے گا۔

زبانی امتحان، (وائیوا) مقالہ کا خلاصہ

مقالہ کا خلاصہ :- اکثر یونیورسٹیوں میں ممتحین کے لیے رسالہ کا خلاصہ (summary)
پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں پوری کتاب کا نچوڑ اور روح کم سے کم الفاظ میں آ جانا چاہیے
جس کے لیے ضروری ہے کہ حسب ذیل باتیں مختصر لفظوں میں بیان کر دی جائیں۔

(۱) موضوع سے متعلق جس مشکل کو حل کرنے اور گتھی کو سلجھانے کے لیے تھیسس لکھی گئی،
اس کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے۔

(۲) گذشتہ محققین کہاں تک پہونچ چکے تھے، اور ریسرچ اسکالر نے کہاں سے
ابتدا کی ہے۔

(۳) بحث کے لیے کیا انداز اختیار کیا گیا ہے، اس ضمن میں موضوع کے ابواب
فصول سب کا ذکر آجائے گا۔

(۴) تحقیق کے دوران جو مواد حاصل ہوا، ہوا اور اس سے جو نتائج مرتب ہوئے
ان کا بیان۔

(۵) اگر کچھ جدید راہیں کھلی ہوں اور کچھ نئے نکتے پیدا ہوئے ہوں۔ تو ان کی
طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ تحقیق کے دوران یہ نئے گوشے سامنے آئے ہیں، لیکن
ان کے لیے مستقل بحث کی ضرورت ہے لہذا میں یا کوئی دوسرا آئندہ قدم بڑھا سکتا ہے۔

خلاصے کا حجم اتنا ہونا چاہیے، کہ اگر پی ایچ ڈی کے لیے تھیسس لکھی گئی ہو تو
پیش کرنے میں آدھ گھنٹہ، اور اگر ڈی۔ لٹ کے لیے لکھی گئی ہو تو تقریباً پون گھنٹہ صرف ہو۔
خلاصہ پیش کرنے کا انداز بھی ممتحین کو متاثر کرتا ہے۔ لہذا ڈیوا میں جانے سے قبل دو تین
مرتبہ مشق کر لینا بہتر ہے۔

خلاصہ پیش کرتے وقت بلکہ وایوا کی پوری مدت میں پر سکون اور با وقار رہنا چاہیے
عبارت میں روانی اور فصاحت ہو، آواز کا زیر و بم کانوں کو بھلا لگنے والا ہو۔ لباس اور
وضع قطع سے بھی بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہو، چھچھورہ پن نہ ظاہر ہو۔ انداز اور الفاظ سے

تکبر و غرور کے بجائے تواضع و انکسار ظاہر ہو، کیونکہ صاحب علم کا بہترین جوہر انکسار ہے۔ "میں یہ کہتا ہوں۔" "میری یہ رائے"۔ ہے کہ بجائے "میرا یہ خیال ہے" "مجھے امید ہے" کہ میرا مقصد واضح ہو گیا ہو گا۔ وغیرہ کہنا چاہیے۔

یقیناً تھیسس میں کچھ کمزور اور اختلافی پہلو بھی آئے ہوں گے۔ وایوا کے موقع پر ان کے دفاع کی پوری تیاری کر کے جائے، لیکن خلاصے میں ان کی طرف اشارہ کر کے، ممتحین کو خود سے گرفت کا، موقع دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ پیش کرنے کے بعد ممتحین کے نقد کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے، ان کے اعتراضات سے گھبراہٹ پیدا نہ ہو۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تیز و تند انداز اختیار کریں لیکن اپنے سکون و وقار میں خلل نہ آنے دے۔ اعتراض کو پوری توجہ سے سننا چاہیے، تاکہ سوال سمجھ کر صحیح جواب دیا جا سکے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ممتحین کے ہر اعتراض کا لازماً جواب دیا جائے، ممکن ہے کہ بعض اعتراضات خود اس کی نظر میں بھی درست ہوں تو کٹ حجتی کے بجائے ان کو قبول کر لینا چاہیے۔

اعتراض کا جواب دیتے وقت عبارت میں الجھاؤ نہ ہو اور غیر متعلق باتیں داخل نہ کرے۔ بلکہ جواب بالکل سوال سے مرتبط، نرم لہجہ میں شگفتہ عبارت کے ساتھ دیا جائے۔

وایوا کا موضوع:۔ وایوا کا موضوع بحث حسب ذیل باتیں ہوتی ہیں۔ اور ان میں کی ہر ایک اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

(۱) تھیسس کی ظاہری شکل و صورت، الفاظ کی صحت و سقم، عبارت کی روانی، اور گنجلک ہونا، علامتوں کا درست یا غلط ہونا وغیرہ۔

(۲) انداز تحقیق، مواد پیش کرنے، اور نتائج اخذ کرنے کا طریقہ۔

(۳) علمی معیار:۔ تحقیق سے کیا علمی فوائد حاصل ہوئے؟ علمی دنیا میں ان کی اہمیت کیا ہے، میدان تحقیق میں کتنے قدم آگے بڑھے ہے؟ مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر نتائج

حاصل کئے گئے یا نہیں۔

اگر عبارت میں کوتاہیاں ہیں، نحوی اور صرفی غلطیاں ہیں، قواعد تحریر و املا کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ تو ممتحنین کے اعتراضات سے سابقہ پڑتا ہے، اور تھیسس کی قدر و قیمت گر جاتی ہے۔

تحقیقات پیش کرنے کے انداز کی بھی بہت اہمیت ہے اگر مواد تو سب اکٹھا ہو، لیکن مناسب ترتیب و تنظیم نہ ہو تو ممتحین کو وہ کباڑیے کی دکان معلوم ہوتی ہے، جہاں ملتا تو بہت کچھ ہے مگر سب بے نظم و بے ترتیب، خلاصہ یہ کہ موضوع اختیار کرنے، مواد حاصل کرنے، عناوین کے انتخاب، ابواب و فصول کے ارتباط، اور ان کو پیش کرنے کا طریقہ یہ سب باتیں تھیسس کی قدر و قیمت کے بڑھانے یا گھٹانے میں بہت دخل رکھتی ہیں۔ اور ان میں سے کوئی گوشہ بھی کمزور ہو تو امتحان میں سخت تنقید و اعتراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک موضوع کے مواد کا تعلق ہے، چوں کہ ریسرچ اسکالر نے اس کی پوری چھان بین کی ہے، اور باتیں اس کے ذہن میں تازہ ہیں، لہذا اس کی معلومات بہ نسبت ممتحین کے زیادہ ہوتی ہیں، تو عام طور پر اس سلسلہ میں ان کو زیادہ گرفت کا موقع نہیں ملتا۔ ہاں پیش کرنے کے انداز مواد سے اخذ کردہ نتائج، ترتیب و تبویب یعنی وہ باتیں جو ریسرچ کی ہیئت سے تعلق رکھتی ہیں ان میں ممتحین زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔ لہذا اگر اس میں ان کو کہیں موقع مل جاتا ہے تو ریسرچ اسکالر کو رگڑ ڈالتے ہیں۔

جہاں تک رسالے کے مواد اور اس سے حاصل ہونے والی قیمتی معلومات اخذ کردہ نتائج کا تعلق ہے تھیسس کی اصل بنیاد اور مقصد یہی ہے صورت و شکل لاکھ عمدہ ہو لیکن مواد کچھ بھی نہ ہو تو اس کی حالت حبشی کے چہرہ پر سرخی پوڈر لگانے کی سی ہوگی۔ لہذا بحث و تنقید کی گہرائی، مواد کا احاطہ، کاروان علم آگے بڑھانے

میں ریسرچ کا حصہ ۔ یہی وہ بنیادی اور اصلی باتیں ہیں ۔ جن میں ریسرچ اسکالر کی محنتوں اور صلاحیتوں کو پرکھا جانا چاہیے، اگر ریسرچ اسکالر نے ان میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے دیا ہے، تو دوسری کمزوریوں سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔

اگرچہ وائیوا کا تعلق موضوع کے اس حصہ سے ہوتا ہے جس پر بحث و تحقیق کے لیے رسالہ لکھا گیا ہے ۔ پھر بھی ریسرچ اسکالر کو پورے موضوع اور اس کے متعلقات سے باخبر ہونا چاہیے ۔ کیونکہ امتحان میں کبھی کبھی موضوع کے ایسے گوشے بھی زیر بحث آجاتے ہیں، جن کو تھیسس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ مثلاً اگر تھیسس کا موضوع آل بویہ کے زمانہ میں عراق کی اقتصادی حالت ہے، تو ریسرچ اسکالر کی ان کے قبل اور ان کے بعد کے اقتصادی حالات، اس زمانہ کے سیاسی حالات، اسلامی ادا رے حکومت میں کس قسم کی اہریں اُٹھتی ہیں، اور کون سے اہم واقعات و حوادث رونما ہوتے رہے ہیں، سب پر اجمالی نظر ہونا چاہیے ۔ کیونکہ کسی زمانہ کی اقتصادیات کا درست اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک ماقبل و مابعد کے حالات بھی پیش نظر نہ ہوں ۔

تاریخ کسی زنجیر کی مسلسل کڑیوں کی طرح مرتبط ہوتی ہے، اقتصادیات پر سیاسی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں، معاشرت کا بھی اس سلسلہ میں بہت دخل ہوتا ہے، لہذا موضوع کے ایک جزا کو سمجھنے کے لیے سب گوشوں پر نظر ہونا ضروری ہے ۔ بنابریں ممتحن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دیکھے ریسرچ اسکالر نے ان تمام گوشوں پر نظر ڈال لی ہے یا نہیں، جو نتیجہ پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں عام طور پر پی ایچ ڈی کے لیے دو ممتحن (ڈی لٹ کے لیے تین ممتحن) ہوتے ہیں، اور ایک سپروائزر ہوتا ہے جس کی زیر نگرانی تھیسس لکھی گئی ہے (ڈی لٹ کے لیے کوئی سپروائزر نہیں ہوتا) وائیوا کی باری اس وقت آتی ہے جب سب کی رپورٹ موافق آجائے، اور سب نے تھیسس کو اس قابل تسلیم کیا ہو کہ اس

پر پی۔ ایچ۔ ڈی یا ڈی۔ لٹ کی ڈگری دی جائے۔

اگر سب کی رپورٹ مخالف ہو، تو تھیسس رد کر دی جاتی۔ اگر رپورٹوں میں میں اختلاف ہو تو کبھی تو ممتحنین کی رپورٹیں ایک دوسرے کے پاس بھیجی جاتی ہیں تاکہ کسی ایک رپورٹ پر اتفاق ہو جاتے اور اتفاق حاصل نہ ہونے کی صورت میں بلکہ کبھی بغیر رپورٹوں کے تبادلہ ہی کے کسی نئے ممتحن کے پاس تھیسس بھیجی جاتی ہے اور اس کی رائے کے موافق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اگر رپورٹ میں کچھ ایسے اعتراضات ہوں جن کی اصلاح اور تجدید نظر کی فرمائش کی گئی ہو، تو ریسرچ اسکالر کو تھیسس واپس کر دی جاتی ہے وہ اصلاح اور تجدید نظر کے بعد دوبارہ داخل کرے۔

ضمیمہ ا

اعراب۔ علامتیں۔ رموزِ اوقاف

اردو میں اعراب :۔ زیر۔ زبر۔ پیش، اور جزم، کو کہا جاتا ہے۔ اعراب ہی کے مرادف "حرکات و سکنات" ہے۔ معروف و مجہول آوازوں کے لیے جو نشانیاں استعمال کی جاتی ہیں، یا بعض اور علامتیں، ان کو رواج عام کے مطابق "علامات" سے موسوم کیا گیا ہے۔ بالعموم ہر لفظ پر اعراب لگانے کی ضرورت نہیں ہے، جو لفظ آسان ہیں اور تحریر و تقریر میں برابر آتے ہیں، ان کے تلفظ سے ذہن اسی طرح واقف ہوتا ہے، جس طرح آنکھیں اس کی صورت سے آشنا ہوتی ہیں، اس لیے نگاہ اور زبان دونوں بیک وقت اس کی تکرار کرتے ہیں۔ مشکل ہوتی ہے ان لفظوں میں جو استعمال عام سے ذرا دور رہتے ہیں، یا جنھیں کسی طرح کا اختلاف ہوتا ہے یا کسی نوع کا اختباس ہو سکتا ہے؟ ایسے لفظوں میں حرکات کا تعین بھی درکار ہوتا ہے، "ذاؤ" ۔ اور "ہی" کے سلسلہ میں یہ بات بھی وضاحت کی طلبگار ہوتی ہے کہ معروف و مجہول آوازوں کے اعتبار سے کیا کیفیت پائی جاتی ہے (وغیرہ) اس کے بغیر غلط خوانی اور بعض جگہ غلط فہمی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

بہت سے مشترک اور کچھ قلیل الاستعمال لفظوں میں تو اعراب نگاری کو لازم قرار دیا جائے گا بعض مقامات اور ہیں جہاں ضبط حرکات کو ضروری سمجھا جائے گا۔ ان میں اہم ترین "اضافات کا زیر ہے" اس کی حیثیت لفظوں کے مختلف فیہ تلفظ کو ظاہر کرنے والے اعراب کی سی نہیں ہے۔ یہ ایک اضافی علامت ہے جو دراصل (ی) کی قائم مقام ہے۔ اس لیے اس کو لکھنا ضروری ہے۔ بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جہاں اضافت کے عدم تعیّن سے اچھا خاصا آدمی غلط خوانی کے پھیر میں آسکتا ہے۔ اُس۔ اِس، اُن۔ اِن۔ اُدھر اِدھر، ان کلمات میں الف پر زیر یا پیش لازماً لگانا چاہیے۔ عربی، فارسی، ہندی وغیرہ کے ایسے الفاظ جن میں تلفظ کی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہو، ان کے بعض اجزا کو جن میں غلط خوانی کا احتمال ہو، حرکت و سکون تعیین کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔

علامات:- علامتیں تین طرح کی ہوتی ہیں:- ایک تو وہ جو کسی حرف کی نمائندگی کرتی ہیں، جیسے تشدید، کہ یہ ایک حرف کی نمائندگی کرتی ہے، جیسے لفظ "مدّت" میں دال پر تشدید کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اصلاً یہ حرف مکرر ہتا (مددت)

دوسری قسم کی علامتیں وہ ہیں جن کو اعراب کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے، جیسے واو معروف پر الٹا پیش۔ اور تیسری قسم میں وہ علامتیں آتی ہیں، جن کی مدد سے بعض لفظوں کے خاص مفہوم کے تعیین میں مدد ملتی ہے۔ یا وہ ایسے مخففات ہوتے ہیں جو کسی مفہوم کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔

الف:- پہلی قسم کی علامتیں، حروف کا درجہ رکھتی ہیں، اس لیے یہ شامل املا ہیں۔ اس فہرست میں (۱) مد (۲) تشدید اور (۳) تنوین کے اعراب (دو زبر، دو زیر، دو پیش) آتے ہیں۔ مد، الف کی قائم مقامی کرتا ہے، جیسے لفظ "آب" میں الف پر مد کی علامت کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دراصل دو الف ہیں (اا ب) تشدید، اسی حرکت کی تکرار کو ظاہر کرتی ہے۔ (مددت) اور تنوین کے اعراب، نون کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ اسی طرح (مدّت)

کی تشدید بھی ایک حرف کی نمائندگی کرتی ہے، لیکن غالباً مد "اور تنوین" کے اعراب نہ لکھنے سے لفظوں کو صحیح پڑھنا مشکل ہوتا ہے، "آب" کو اگر مد کے بغیر لکھا جائے تو اس "اب" پڑھا جائے گا، اور "عموماً" کو دو زبر کے بغیر "عموا" بروزن فردا پڑھا جائے گا۔ مگر "مدت" کو (بغیر تشدید کے بھی) "مدت" اور "متعلق" کو "متعلّق" ہی پڑھا جائے گا۔ لہذا "مد" اور "تنوین" کی طرح تشدید کا التزام نہیں رہا، لیکن بہت سے مقامات پر تشدید کے بغیر الجھن پیدا ہو سکتی ہے "ردی" "رِدّی" دو لفظ ہیں، تشدید کے بغیر انھیں امتیاز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی صورت "ندی" اور "ندّی" کی ہے، بہرطور جہاں تک ممکن ہو تشدید کا التزام کرنا چاہیے۔

ب :- دوسری قسم کی علامتوں میں حسب ذیل علامتوں کو متعارف نقوش کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، ان علامتوں کو حسب ضرورت استعمال کرنا چاہیے۔

(۱) یائے معروف (چھوٹی ی) لفظ کے آخر میں پوری لکھی جاتی ہے اور یہی ٹھیک ہے۔، جیسے زندگی، خوشی۔ جب یہ درمیان لفظ میں آئے گی اور کسی طرح کے اشتباہ کا احتمال ہوگا، تو اس کے نیچے "کھڑا زیر" (ا) لگایا جائے گا، جیسے، میت، پیٖت، تیٖر، پیٖر۔ یائے مجہول (بڑی ے) آخر میں پوری لکھی جاتی ہے۔ اس صورت میں، اے۔ جب یہ درمیان لفظ میں آئے اور ملا کر لکھی جائے تو اگر ضرورت سمجھی جائے تو اس سے پہلے والے حرف پر زیر لگایا جائے جیسے دیِر، بیِر، تیِر، میل۔ یائے مجہول پر کوئی علامت نہیں لگائی جائے گی، اور یائے معروف سے پہلے والے حرف پر زیر نہیں لگایا جائے گا۔

(۲) واوِ معروف پر الٹا پیش بنایا جائے گا، جیسے، چوٗر، دوٗر، نوٗر۔ طوٗر۔ واوِ مجہول پر کوئی علامت نہیں آئے گی ضرورت پڑے پر، اس سے پہلے حرف پر پیش لگا دیا جائے گا، جیسے مُور۔ کُور۔ جُوڑ۔

(۳) واو ماقبل مفتوح اور ی ماقبل مفتوح ان کے حروف ماقبل پر زبر لگایا جائے گا۔

پَیر، دَیر، دَور، جَو۔

ج :۔ وہ علامتیں جن کی مدد سے لفظوں کے ایک خاص مفہوم کی تعین میں مدد ملتی ہے ۔

(۱) ؁ ۔ یہ نشان تخلص کی علامت ہے، جیسے اسدؔ، ذوقؔ ۔ تخلص کو اس نشان کے بغیر کبھی نہیں لکھا جائے گا ۔

(۲) ــــــــ : خاص ناموں : افراد کے نام کتابوں کے نام، مقامات کے نام کے اوپر ان کو، عام عبارت سے ممتاز کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی لکیر بنا دی جاتی ہے ۔

کبھی پورے جملے یا جملوں کے مجموعے کو خط کشیدہ قرار دیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خاص طور پر اس جملے یا جملوں کی طرف متوجہ ہو جائے ۔

یہ علامت کبھی اعداد کے درمیان لائی جاتی ہے، اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس ہندسہ سے اس ہندسہ تک یہ بیان یا یہ باب (وغیرہ) پھیلا ہوا ہے جیسے :۔ حروف علت کا بیان ۲ ــــ ۱۸ مطلب یہ ہے کہ حروف علت کا بیان، ص ۲ سے ص ۱۸ تک کیا گیا ہے ۔ یہ استعمال فہرست مضامین میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے ۔

(۳) . . . : نقطے علامت کے طور پر تین صورتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں ۔

(۱) کسی عبارت یا شعر کے شروع کے چند لفظ لکھ کر، چند نقطے لگا دیے جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس شعر یا عبارت کے ابتدائی لفظ لکھے گئے ہیں، وہ شعر یا عبارت مکمل طور پر مراد ہے ۔ کبھی عبارت کے شروع اور آخر کے چند لفظ لکھ کر، بیچ میں نقطے بنا دیے جاتے ہیں مطلب اس کا بھی وہی ہوتا ہے ۔ یہ عبارت یا شعر یا تو پہلے آ چکے ہوتے ہیں، یا اس قدر معروف ہوتے ہیں کہ ذہن ان کی طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے ۔

(۲) کسی عبارت کے صرف ضروری اجزا کو نقل کرنا مقصود ہوتا ہے، اس صورت میں جہاں جہاں سے اجزا ترک کیے جاتے ہیں نقطے لگا دیے جاتے ہیں ۔

(۳) کرم خوردگی یا کسی اور وجہ سے کسی عبارت کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے، ایسی صورت میں نقل کرتے وقت اس جگہ نقطے لگائے جائیں گے ۔

(۴) مع : یہ مصرعہ کی علامت ہے۔ اگر عبارت کے درمیان مصرع آئے تو اسے ضرور لکھنا چاہیئے، تاکہ مصرع نثری عبارت سے ممتاز ہو جائے۔

(۵) سہ ۵ : حواشی کے لیے اس علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ عبارت میں متعلق مقام پر یہ علامت بنا کر اس پر ہندسہ لکھا جائے گا۔ "سلہ" پھر حاشیہ پر اسی کا ہندسہ کی تکرار کی جائے گی۔ اس محل پر (عــ) شکل کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

(۶) ص : صفحہ کی علامت جیسے : ص ۱۲۲، مطلب ہے صفحہ ۱۲۲۔ اسکی ایک صورت (صــ) بھی ہے۔ لیکن ص، کے بعد ہندسہ تحریر کیا جاتا ہے، اور "صــ" کے اوپر ہندسہ لکھا جاتا ہے

(۷) ج : جلد کی علامت ہے جیسے : ہند شناسی، ج ۱، ص ۲۱۰، یعنی پہلی جلد کا صفحہ ۲۱۰

(۸) = : یہ علامت برابر ہونے کو ظاہر کرتی ہے، کسی کتاب وغیرہ کے مخفف نام کو اس علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے، جیسے : قاطع برہان ورسائل متعلقہ = قاطع۔ یعنی جہاں پر قاطع آئے، اس سے قاطع برہان ورسائل متعلقہ مراد ہوں گے۔

(۹) ؑ : برائے علیہ السلام، جیسے عیسیٰؑ، یعنی عیسیٰ علیہ السلام

(۱۰) رح : رحمت اللہ علیہ کا مخفف ہے،

(۱۱) صلعم : "صلی اللہ علیہ وسلم" کی مخفف صورت ہے، دوسری صورت ص : یہ بھی اسی جملہ کا مخفف ہے

(۱۲) ،، : "ایضاً" کی علامت ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے اوپر کے اندراج کے مطابق۔

(۱۳) / : رقم، تاریخ، اور وزن کے آگے یہ علامت بنائی جاتی ہے جیسے ۳/ (تین آنے)، ۵ر (پانچ روپے)، ۳/ مارچ (مارچ کی تیسری تاریخ)

(۱۴) کذ : جب کسی دوسرے کی عبارت میں دخل دہی مناسب نہ ہو، اور لکھنے والے کی نظر میں صحیح نہ ہو، یا صحیح نہ ہونے کا احتمال ہو ایسے مواقع پر قوسین میں "کذ" لکھ دیا جاتا ہے۔

ہر مصنف کو اختیار ہے کہ اس کی کتاب میں جو نام کثرت سے آنے والے ہوں ان کے

لیے کچھ مخففات معین کرے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا ہی میں ان کی صراحت کی جائے۔

رموز اوقاف[1] :۔ اوقاف یا وقفے، ان علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے، یا کسی ایک جملے کے ایک حصہ کو دوسرے حصوں سے علاحدہ کریں ان اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اول تو ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے، اور وہ تھکنے نہیں پاتی؛ دوسرے بڑی بات یہ ہے کہ ذہن ہر جملے، یا جز جملہ کی اہمیت کو جان لیتا ہے، اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

جو علامتیں، وقفوں کے اظہار کے لیے استعمال کی جاتی ہیں، ان کے نام اور شکلیں حسب ذیل ہیں۔

تفصیل	انگریزی نام	اردو نام	علامت
چھوٹا ٹھہراؤ،	COMMA	سکتہ	،[2]
ٹھہراؤ	SEMICOLON	وقفہ	؛
ملاؤ یعنی مجمل سے مفصل کو ملانے والا	COLON	رابطہ	:
(جملے کا اختتام)	PULSTOP	ختم	۔
جذبے کے اظہار اور حرف ندا کے بعد	NOTEOFINTERROGATION	سوالیہ	؟
	NOTEOFNEXCLMATION	خجلیہ، ندائیہ	!
	BRAKET	قوسین	( ) یا [ ]
	INVEPTEDCOMMAS	واوین	" "

[1] اردو املا کے مصنف نے یہ حصہ مولوی عبدالحق کی کتاب قواعد اردو سے لیا ہے [2] کاما، فل اسٹاپ، بریکٹ، کا استعمال اردو میں اس کثرت سے ہوتا ہے کہ یہ لفظیں زبان اردو کا جز ہو بن گئی ہیں، لہٰذا بظاہر ان کے لیے الگ نام وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ "سکتہ" کے بجائے "کاما" اور "ختمہ" کے بجائے "فل اسٹاپ" زیادہ معروف ہے۔

علامتوں کا محل استعمال :-

(۱) سکتہ: یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ حسب ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ایسے اسماء یا ضمائر کے بیچ میں جو ایک دوسرے کے بدل کا کام دیتے ہوں، جیسے: جہاں گیر، ابن اکبر، شہنشاہ ہندوستان نے جب .....

(۲) ایک ہی قسم کے کلمے کے ان تین، یا تین سے زائد لفظوں کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں (اس حالت میں جب کہ حرف آخری دو حرفوں کے درمیان حرف عطف یعنی "و، یا اور یا حرف تردید یعنی یا، آئے)۔ (۱) حیدرآباد، میسور اور تراونکور جنوبی ہند کی ریاستیں ہیں .....

(۳) ندائیہ لفظوں کے بعد جیسے، جناب صدر، خواتین و حضرات۔

(۴) جب ایک ہی درجے یا رتبے کے لفظ جوڑوں میں استعمال ہوں، تو ایک جوڑے اور دوسرے جوڑے کے درمیان سکتہ دیتے ہیں: دن ہو یا رات، سفر ہو کہ حضر، خلوت ہو کہ جلوت انسان کو چاہئے خدا کو نہ بھولے۔

(۵) ایسے اجزاءِ جملہ کے درمیان جو تشریحی ہوں، سکتہ آتا ہے: یہ چبوترا ۳۰ فٹ لمبا، ۲۰ فٹ چوڑا، ۵ فٹ اونچا ہے۔

(۶) دو یا زیادہ ایک ہی درجہ کے ایسے چھوٹے جملوں کے بیچ میں جو ایک بڑے جملے کا جزو ہوں میں گھر سے بازار گیا، بازار سے مدرسہ آیا، اب مدرسہ سے گھر واپس جاتا ہوں......

(۸) ایسے جملوں کے بیچ میں جو مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کا بیان کریں:۔ وہ شخص ایماندار ہے، لیکن سست۔ سارا زمانہ آیا، پر زید نہ آیا۔

(۹) جب ایک سادہ جملہ دوسرے کی توجیہ کرے، تو دونوں کے بیچ میں سکتہ آتا ہے: میں نہیں گیا، اس لیے کہ وہ خود ہی میرے ہاں آ پہنچا۔ گھر پہنچے نوکری مل گئی،

پھر باہر کیوں جاتا۔

(۱۰) جب کسی فعل کے بعد "کر" یا "کے" مقدور ہو، تو سکتہ لانا ضروری ہے: وہ چھتری ہاتھ میں لے، نکل کر کھڑا ہوا۔ وہ یہ جا وہ جا، چمپت ہو گیا۔

(۱۱) جب مبتدا اور خبر کے بیچ میں کوئی حجاب نہ ہو، تو سکتہ ضرور ڈال دیتے ہیں۔ یہی مجموعہ یا انتخاب مضامین مطبوعہ، رسالے کا نہایت عمدہ اشتہار بھی بن گیا۔ حالی، مسدس حالی کے مصنف ہیں....

(۱۲) عبارت اور خصوصاً شعر کی تعقید کو دور کرنے کے لیے بھی سکتہ لگاتے ہیں:...
سب، رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے .....

(۱۳) اور، یا وغیرہ سے پہلے جب ہی سکتہ لگاتے ہیں کہ لفظوں پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہو۔

(۲) وقفہ ؛

جب سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ کی ضرورت پڑے، تو وقفہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا استعمال حسب ذیل موقعوں پر ہوتا ہے:

۱۔ جملے کے لمبے لمبے اجزا کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے کے لیے۔

۲۔ جہاں جملوں کے مختلف اجزا پر زیادہ تاکید دینا مدِ نظر ہوتا ہے، وہاں بھی وقفے استعمال ہوتے ہیں: جو کرے گا، سو پائے گا؛ جو بوئے گا، سو کاٹے گا؛

۳۔ جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہذا، اگرچہ، چہ جائے کہ، در آں حالیکہ، لیکن اور اسی قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں؛ وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے، ان لفظوں سے پہلے وقفہ کی علامت لگاتے ہیں.......

۴۔ جن صورتوں میں سکتہ لاتے ہیں، ان میں وقفہ صرف ایسی حالت میں لائیں

گے جب جملے کے بعض ایسے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑے جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہے: (ا) حیدر آباد، میسور اور ٹراونکور، جنوبی ہند کی؛ بھوپال، گوالیار، اور اندور، وسط ہند کی ریاستیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۳) رابطہ: اس کا ٹھہراؤ، وقفے کے ٹھہراؤ سے زیادہ ہوتا ہے۔

۱۔ عام طور پر اس کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے، جب جملے کے کسی سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے: "انسان کو بعض کاموں کی قدرت ہے، بعضوں کی نہیں: وہ چل سکتا ہے، دوڑ سکتا ہے، مگر اڑ نہیں سکتا۔"

۲۔ جب کسی مختصر مقولے یا کہاوت وغیرہ کو بیان کرنا ہو، تو تمہیدی جملے اور اس جملے کے بیچ میں رابطہ لاتے ہیں:

(ا) کسی حکیم کا قول ہے: آپ کاج، مہا کاج۔

(ب) بقول شاعر: عیب بھی کرنے کو، ہنر چاہیے۔

(ج) سچ ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

[استعمالاب یہ صورت ہے کہ نقل قول، نقل اقتباس (نثر یا نظم) تشریح و تفسیر، بیان تفصیلات اور مثالوں سے پہلے، اسی علامت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔]

(۴) ختمہ۔

۱۔ یہ علامت مکمل جملے کے خاتمہ پر لگائی جاتی ہے۔ جہاں ٹھہراؤ بھرپور ہوتا ہے: دنیا دار العمل۔ جب طبیعت خراب ہو تو کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔ مخففات کے بعد بھی یہ علامت لگا دیتے ہیں: کے۔ سی۔ ایس آئی۔ بی۔ اے۔

صرف انگریزی کے مخففات کے بعد۔ عربی کے مخففات کے بعد اکثر نہیں لگاتے: ص، صلعم، عہ، رضیوں ہی لکھے جاتے ہیں۔ (جب ایک سے زیادہ

مخففات ایک ہی سلسلہ میں لکھے جائیں تو ہر مخفف کے بعد، سکتے کی علامت دینی چاہیئے:
(ا) ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹرایٹ لا۔ (ب) ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر، جی۔سی۔ایس۔آئی، جی۔سی۔بی۔ایس۔"

(۵) واوین " "

جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے، یا کسی کا قول اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے اول اور آخر یہ علامت لگائی جاتی ہے: اس نے جواب دیا "میں کل دس بجے یہاں پہونچے گا۔"

(۶) فجائیہ !

یہ ان الفاظ یا جملوں کے بعد لگائی جاتی ہے، جن سے کوئی جذبہ ظاہر کرنا ہوتا ہے، جیسے: غصہ، حقارت، استعجاب، خوف وغیرہ۔ جذبہ کی شدت کی مناسبت سے، ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگا دیتے ہیں۔ (ا) افواہ! سخت تکلیف ہے! (ب) معاذ اللہ! (ج) بس صاحب! بس!! .....

یہ علامت، منادا کے ساتھ بھی استعمال کی جاتی ہے اور اس کو "ندائیہ" بھی کہتے ہیں۔ جیسے: مومن! یہ لاف الفت تقوی ہے کیوں، اگر دل میں کوئی دشمن ایمان نہیں رہا؟ صنم! تری بھی ادا کا کوئی کوئی جواب نہیں۔

(۷) سوالیہ ؟

سوالیہ جملے کے آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے: کیا ہے؟ کس کی باری ہے؟۔
اس علامت کا ایک محل استعمال یہ بھی ہے کہ جب کسی لفظ جملے یا شعر کو بہ لحاظ صحت مشکوک سمجھا جاتا ہے، تو اس کے بعد قوسین میں اس علامت کو لکھ دیتے ہیں، .....
(اس صورت میں علامت کا قوسین میں لکھا جانا ضروری ہے۔)

(۸) قوسین ( )

یہ علامتیں ..... جملہ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہیں: میرا گھر (یعنی مکان کا وہ حصہ جس میں سکونت ہے) بوسیدہ ہوگیا ہے۔

ہدایات: قوسین کے استعمال کرنے میں بات کا بہت خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے بے جا استعمال سے، عبارت بے ربطہ نہ ہوجائے۔ بہت سے لکھنے والے اس کی پروا نہیں کرتے؛ اور آجکل ایسے اکھڑے ہوئے جملے بہت دیکھنے میں آتے ہیں:۔

(ا) محمود علی صاحب (جن کے بڑے بھائی الہ آباد میں تحصیل دار ہیں) کو میں نے کل موٹر پر جاتے دیکھا۔

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب (جو اردو محلے میں رہتے ہیں اور بڑے حاذق طبیب ہیں) اسے میں نے رجوع کیا۔ ان جملوں میں قوسین کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے تھا:۔

(ا) محمود علی صاحب کو (جن کے ...... ہیں) میں نے ......

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب سے (جو اردو محلے ..... طبیب ہیں) میں نے رجوع کیا۔

ضمیمہ ۲

ہندوستان کے بعض ان کتب خانوں کی فہرست دی جاتی ہے جن سے اسلامیات پر تحقیق کرنے والے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۔ آزاد لائبریری	مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ
۲۔ اسلامک اسٹڈیز لائبریری	〃 〃	〃
۳۔ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن	۸ شیفز روڈ	بمبئی
۴۔ اسلامیہ عربک کالج لائبریری		کرنول (اے۔پی)
۵۔ ادارۂ ادبیات اردو	خیریت آباد	حیدرآباد
۶۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال لائبریری		کلکتہ
۷۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بامبے		بمبئی
۸۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز	ہمدرد دواخانہ وقف	دہلی
۹۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (آصفیہ لائبریری)	افضل گنج برج	حیدرآباد
۱۰۔ بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ		پونا
۱۱۔ تامل ناڈو گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری - جی پاک		مدراس ۵
۱۲۔ ٹونک اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری		ٹونک (راجستھان)
۱۳۔ ٹیگور لائبریری	لکھنؤ یونیورسٹی	لکھنؤ
۱۴۔ جامعہ محمدیہ عربک کالج لائبریری		رایادرگ (اے۔پی)
۱۵۔ کتب خانہ جنت مآب	عقب مسجد تحسین چوک	لکھنؤ
۱۶۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری		پٹنہ

۱۷۔ دار العلوم ندوۃ العلما — ڈالی گنج — لکھنؤ

۱۸۔ دار العلوم دیوبند — سہارن پور

۱۹۔ دائرۃ المعارف — عثمانیہ یونیورسٹی — حیدر آباد

۲۰۔ ڈائرکٹر آف پبلک اینڈ ریسرچ لائبریری (بتوسط کشمیر لائبریری امر سنگھ باغ) سرینگر (کشمیر)

۲۱۔ رضا لائبریری — قلعہ — رام پور

۲۲۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری — حیدر آباد

۲۳۔ فیکلٹی آف تھیالوجی — ولایت منزل مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

۲۴۔ مدراس یونیورسٹی۔ اورینٹل سکشن مدراس یونیورسٹی — مدراس

۲۵۔ محمود آباد لائبریری — قلعہ — محمود آباد (سیتا پور)

۲۶۔ کتب خانہ ناصریہ، لال بہادر شاستری روڈ — لکھنؤ

مذکورہ بالا لائبریریوں میں مخطوطات کے اعتبار سے، خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ، آصفیہ لائبریری حیدر آباد، سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدر آباد، کتب خانہ جنت مآب لکھنؤ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان مشہور کتب خانوں کے علاوہ لکھنؤ میں مدرسہ سلطان المدارس میڈیکل کالج کراس، مدرسۃ الواعظین کیننگ اسٹریٹ، مدرسہ ناظمیہ وکٹوریہ اسٹریٹ، کتب خانہ فرنگی محل میں بھی اسلامیات کے متعلق ذخائر موجود ہیں۔

(ختم شد)